روہیل کھنڈ میں اردو شاعری 1857ء تک

مقالہ نگار

محمد فیضان

20HUHL05

نگراں

پروفیسر حبیب نثار

شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز،

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

500046

فہرست

پیش لفظ		3
باب اول	روہیل کھنڈ کا تاریخی پس منظر	6
باب دوم	روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقا	31
باب سوم	روہیل کھنڈ کے چند نمائندہ شعرا	68
باب چہارم	روہیل کھنڈ کی شاعری کی ممتاز خصوصیات	170
اختتامیہ		192
کتابیات		195

پیش لفظ

دہلی میں جب شعروسخن کا دورِرواں دواں تھا اسی عہد سے روہیل کھنڈ میں بھی شاعری کی روایت قائم ہے۔ روہیل کھنڈ کی شاعری پر 1774ء کے بعد دبستان رامپور کے پس منظر میں عہد شباب تو نظرآتا ہے لیکن یہاں کے ابتدائی دور پر آج تک کسی نے خاطر خواہ قلم نہیں اٹھایا پس میں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ یہاں کی شاعری کی ابتدائی روایت کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ دنیائے ادب اس سے روشناس ہو سکے۔لہٰذا اسی غرض سے میں نے اپنے ایم۔فل مقالے کے لیے استاذ محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب سے مشورہ کیا۔استاذ محترم نے روہیل کھنڈ کے عنوان کو قبول فرمایا اور تجویز پیش کی کہ اس عنوان کے تحت 1857ء تک کی شاعری پر کام کریں۔لہٰذا ان کی تجویز پر مقالے کا عنوان (روہیل کھنڈ میں اردو شاعری 1857ء تک) طے پایا۔

میں نے اس مقالے میں روہیل کھنڈ کی 1857ء تک کی اردو شاعری کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کام کو انجام دینے کے لیے سب سے پہلے میں نے اردو شعرا کے تذکروں کی مدد سے روہیل کھنڈ کے شعرا کی فہرست تیار کی اور ان شعرا پر دیگر مطلوبہ کتب کی تلاش وجستجو کے بعد ان کی مدد سے بلکہ ہر ممکنہ ماخذ سے مواد اکھٹا کرنے کے بعد روہیل کھنڈ کی 1857ء تک کی اردو شاعری کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

بنیادی طور پر یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی روایت اور اس کے عروج کو بیان کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں چند نمائندہ شعرا کے حالات اور ان کے رنگ سخن سے روہیل کھند کی ممتاز خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول: روہیل کھنڈ کا مختصر تاریخی پس منظر۔

اس باب میں روہیل کھنڈ کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے تا کہ اس عہد کے سیاسی و معاشی ماحول اور ساتھ ہی اس علاقے کی حدود کا نقشہ نگاہ میں رہے اور اس کی روشنی میں شعرائے روہیل کھنڈ کی شعری خدمات اور ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں مدد مل سکے۔

باب دوم: روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقا۔

اس باب میں روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی روایت اور اس کی ارتقائی منزلوں کو شعرا و نوابین کے مختصر حالات اور شعری خدمات کے حوالے سے طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم: روہیل کھنڈ کے چند نمائندہ شعرا۔

اس باب میں روہیل کھنڈ کے 1857ء تک شعرا کی فہرست میں سے چند نمائندہ شعرا نواب محمد یار خان امیرؔ، قائمؔ چاند پوری، مولوی غلام جیلانی رفعتؔ، قدرت اللہ شوقؔ، نواب محبت خان محبتؔ، شاہ نیازؔ احمد بریلوی، میر غلام علی عشرتؔ، اخون زادہ احمد خان غفلتؔ، شیخ علی بخش بیمارؔ اور سید نظام شاہ نظامؔ کے حالات و کوائف، ان کی ادبی خدمات اور ان کی شاعرانہ طرز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب چہارم: روہیل کھنڈ کی ممتاز خصوصیات۔

اس باب میں روہیل کھنڈ کے نمائندہ شعرا کے اشعار کے حوالے سے یہاں کی ممتاز خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان خصوصیات کو بروئے کار لانے کی وجوہات کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالے کے مکمل ہونے کے بعد میرا فریضہ بنتا ہے کہ میں ان تمام افراد کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس مقالے کے مکمل ہونے میں تعاون کیا اور جن کی شفقتوں، مہربانیوں اور حوصلہ افزائیوں کی وجہ سے میں یہ کام مکمل کر سکا۔

سب سے پہلے میں اپنے مشفق رہنما استاذ محترم ماہر دکنیات رہرو موسیقی پروفیسر حبیب نثار صاحب شعبۂ اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذات اظہار تشکر سے بالاتر ہے ان کی شفقتوں اور مہربانیوں کے سلسلے میں میرے جو جذبات ہیں اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ ناکافی

ہیں۔ اگر قدم قدم پر مجھے ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نہ ملی ہوتی تو اس کام کو مکمل کر پانا ناممکن تھا۔

میں پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب صدر شعبۂ اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد کا بے حد ممنون و متشکر ہوں کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا اور اپنے شعبہ سے ایم۔فل کرنے کی اجازت دی اور میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس کے علاوہ میں شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ خصوصاً ڈاکٹر زاہد الحق صاحب جنھوں نے اس مقالہ کے متعلق کتب کی نشان دہی کی، ڈاکٹر عبدالرب منظر صاحب، ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ، ڈاکٹر کاشف صاحب، ڈاکٹر نشاط احمد صاحب اور ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

میں اپنے تمام ساتھیوں جنھوں نے کسی نہ کسی ذریعے سے میرے اس کام میں مدد کی خصوصاً محمد ظفر القادری صاحب ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف حیدر آباد جنھوں نے اپنی مصروفیات کے چلتے ہمیشہ میرے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا اور ہر طرح سے میری مدد کے لیے کوشاں رہے، محمد سالم غزالی صاحب ریسرچ اسکالر مہاتما جیوتیبا پھولے روہیل کھنڈ یونی ورسٹی جنھوں نے مواد کی فراہمی میں میری ہر ممکن کوشش کی، محمد عمر رضا صاحب ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، محمد آصف رضا صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور محمد ثامر رضا صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے نوازا اور ہر موقع پر عملی تعاون دیا۔

میں رضا لائبریری رامپور کے کارکنان کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ میری ضرورتوں کے مطابق کتابیں فراہم کیں۔

آخر میں میں اپنے گھر کے افراد کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں ذہنی و معاشی دونوں اعتبار سے میری مدد کی۔

راقم الحروف

محمد فیضان

شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدر آباد

باب اول

روہیل کھنڈ کا تاریخی پس منظر

روہیل کھنڈ کا تاریخی پس منظر

ہندوستان کے نقشے میں اگرچہ روہیل کھنڈ کے نام سے آج کوئی ریاست موجو نہیں لیکن روہیل کھنڈ نام کی ایک ریاست ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش میں تقریباً دوسو سال (1741ء سے 1949ء تک) قائم رہ چکی ہے۔اتر پردیش کے موجودہ اضلاع بجنور، مرادآباد، رامپور، بریلی، پیلی بھیت، بدایوں، شاہجہاں پور، سنبھل اور امروہا اسی ریاست روہیلکھنڈ کا حصہ تھے۔اب بھی یہ علاقہ روہیل کھنڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔آزادی کے بعد ان اضلاع پر مشتمل روہیل کھنڈ نام کی ایک کمشنری باقی تھی جو کہ بعد میں بریلی اور مرادآباد کمشنری میں منقسم ہوگئی۔موجودہ وقت میں روہیل کھنڈ نام کی یادگار بریلی میں واقع فقط روہیل کھنڈ یونیورسٹی ہے۔

مہابھارت میں یہ علاقہ پانچال کے نام سے ملتا ہے جس کی حکومت کوہ ہمالہ سے دریائے چنبل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دارالسلطنت اہی چھترا تھا۔اس بڑی حکومت میں درپد نام کا ایک راجہ بہت مشہور ہوا۔یہ اہی چھترا آنولہ (جو آج بریلی ضلع کی تحصیل کا درجہ رکھتی ہے) اور شاہ باد (اس کو رامپور ضلع کی تحصیل کا درجہ حاصل ہے) کے درمیان واقع ہے جس کو آج رام نگر کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہاں آج بھی قدیم قلعے اور گڑھیوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔یہ علاقہ گھنے جنگلات سے گھرا تھا۔1000 ق م یہاں انسانی زندگی کی کثرت تھی۔جگہ جگہ بستیاں تھیں ان بستیوں میں رہنے بسنے والوں کی اپنی ٹھکرات تھی۔یہ لوگ بہت فعال اور خوش حال تھے۔جین مت کے تیئیس ویں گرو پارس ناتھ نے بھی 750 ق م باقاعدہ تپسیا کے لیے یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔مولانا نجم الغنی کٹھیر کے مورخوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کٹھیر مسلمان مورخوں نے لکھا ہے اور کٹھیر بھی پانچالہ سلطنت کا ایک حصہ تھا جن کی

حکومت کی نسبت مہابھارت میں ذکر ہے کہ ہمالہ سے دریائے چنبل تک ان کی حکومت تھی اور اس کا دارالسلطنت اہی چھترا تھا جس کو کننگھم نے پرگنہ سرولی ضلع بریلی میں رام نگر تجویز کیا ہے اور جو فی الحال مرادآباد کے ضلع کی حد سے چند میل کے فاصلہ پر ہے'' ۱؎

رفتہ رفتہ یہاں حملے ہونے شروع ہوئے اور یہ علاقہ دوسری حکومتوں میں تبدیل ہوتا رہا۔ 650ق م سے 486 ق م تک جب مگدھ پرششوناگ کے خاندان کی حکومت رہی تو پانچال بھی اس حکومت سے متاثر رہا۔ یہ حکومت اس وقت کی شمالی ہند میں دوسری اہم حکومت تھی اس کی راجدھانی کپل دستوموجودہ گورکھپور تھی۔ پانچال پر 300ق م کے لگ بھگ اس حکومت کے آثار بہت نمایاں ہو چکے تھے۔

300ق م سے باضابطہ پانچال کا علاقہ بھی اشوک کے حکومت میں آ گیا تھا اس پر اس خاندان نے 184ق م تک حکومت کی۔ اس کے بعد یہ حکومت کمزور ہوتی گئی اور مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ 100ء سے 200ء تک اس علاقہ پر کشان کی حکومت کی فوجوں نے بار بار حملے کیے اور اس علاقے کو مزید کمزور کر دیا۔ 320ء سے 455ء تک گپت خاندان پانچال اور اودھ پر قابض رہا۔ 455ء سے 647ء تک شمالی ہند افراط وتفریط کا شکار رہا اور پانچال بھی۔ راجہ ہرش وردھن تخت نشینی قنوج 606ء وفات 647ء نے اپنے دور حکومت میں پانچال پر قبضہ کر لیا تھا۔

650ء سے 1206ء تک شمالی ہند میں راجپوتوں کا اجماع کثرت سے ہوا۔ 700ء میں اس علاقہ پر ٹومر راجپوت قابض ہوئے ان کا دارالسطنت سنبھل تھا۔ 1150ء کے لگ بھگ چوہان راجپوتوں کا پانچال پر تسلط ہوا۔ ان میں پرتھوی راج چوہان 1180ء میں تخت دہلی پر متمکن ہوا اسی نے اپنے عہد میں اپنے لیے امروہہ اور سنبھل میں نہایت مضبوط قلعے تعمیر کرائے جس کے آثار آج بھی سنبھل میں موجود ہیں۔ نجم الغنی مسٹر الگزینڈر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلے راجپوت حملہ آوروں میں سے ۷۰۰ء میں ٹمر قوم نے حملہ کیا اور سنبھل کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔۔۔ٹومر قوم قریب گیارہ سو پچاس عسوی تک رہی مگر ان کی حکومت مستقل نہ رہی۔۔۔چوہانوں نے ٹومر قوم کی جگہ لی اور اسی طرح آپس کے جھگڑوں سے مسلمان حملہ آوروں کو موقع دیا۔ ۱۱۸۰ء میں مشہور پرتھوی راج چوہان جو کہ ٹومری عورت سے پیدا تھا دلی کے تخت پر بیٹھا اور اس نے غالبا مسلمانوں کے خوف سے سنبھل میں ایک مستحکم قلعہ بنایا'' ۲؎

1004ء میں کٹھیر یا نامی سورج بنسی قنوج بدر کر دیئے گئے۔ یہ لوگ یہاں آ کر بس گئے یہ ایک بڑی تعدا میں تھے اور نسلا راجپوت تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری راجپوت قومیں بھی یہاں آ کر آباد ہوگئیں جو ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ اگر چہ شمالی ہند میں 650ء سے راجپوتوں کی آمد شروع ہو چکی تھی لیکن ان راجپوتوں میں کٹھیر یا راجپوت تعدمیں

زیادہ تھے اور بہت جری بھی۔ اس طرح کٹھیریوں کی بہتات اور بالادستی کی بنیاد پر اس علاقہ کا نام پانچال کی جگہ کٹھیر پڑ گیا۔ مولانا نجم الغنی لکھتے ہیں:

''جب سے کٹھیریا نامی ایک قوم سورج بنسیوں میں سے جو قنوج سے نکالی گئی تھی ممالک متحدہ میں آکر آباد ہوئی یہ ملک کٹھیر کہلایا'' ؎۳

سید سالار مسعود غازی 1028ء یا 34ء میں امروہہ اور سنبھل آئے اور کئی دن کی مسلسل جنگ کے بعد فتح یاب ہوئے کچھ دن یہاں قیام کرنے کے بعد قنوج پر حملہ آور ہوئے اس کے بعد بہرائچ کی طرف بڑھے اور بہرائچ کی جنگ میں شہید ہوگئے۔ 1072ء میں بلدیو چوہان کٹھیر پر قابض ہوا، اس طرح چوہان راجپوت 1193ء تک کٹھیر پر حکمران رہے۔

1192ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے بھٹنڈہ پر حملہ کیا لیکن پرتھوی راج چوہان کی دولاکھ فوج کے آگے شکست ہوئی اور غزنی واپس ہوگئے۔ دوسرے سال 1193ء میں شہاب الدین غوری نے تھانیسر پر حملہ کیا اور پرتھوی راج چوہان کو شکست ہوئی اور اس کو قید کر لیا گیا۔ 1194ء میں شہاب الدین غوری نے پھر حملہ کیا۔ اس وقت راجہ جے چند قنوج کا حکمران تھا۔ چندواڑہ کے علاقے میں جنگ ہوئی اور راجہ جے چند کو شکست ہوئی جس کے نتیجہ میں کٹھیر پر شہاب الدین غوری کا قبضہ ہوگیا۔

شہاب الدین غوری کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے اپنی حکومت اپنے غلاموں کو چار حصوں میں تقسیم کر دی۔ جب شہاب الدین غوری کا 1206ء میں انتقال ہوا تو دہلی مع کٹھیر قطب الدین ایبک کے حصہ میں آیا۔ قطب الدین ایبک نے اپنے ایک غلام شمس الدین التمش کو کٹھیر کا حاکم مقرر کیا۔ التمش نے اپنا دارالسلطنت بدایوں کو بنایا۔ جب قطب الدین ایبک کا 1210ء انتقال ہوا تو ایبک کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن التمش نے اسے معزول کر دیا اور خود دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا اور کٹھیر میں اپنی جگہ نصر الدین طغاں کو ناظم مقرر کیا۔ 1206ء سے 1290ء تک غوری پٹھانوں کے غلام خاندان کی ہندوستان پر حکومت رہی۔ اس درمیان کٹھیر غلام خاندان کے زیر اثر رہا۔ اس زمانے میں صدر مقام بدایوں رہا کچھ عرصہ کے لیے سنبھل بھی رہا۔

1290ء سے 1320ء تک ہندوستان پر خلجیوں کی حکومت رہی اس درمیان بھی خلجی خاندان کی طرف سے کٹھیر پر حاکم مقرر ہوتے رہے۔

1320ء میں تغلق خاندان کی ابتدا ہوئی اور 1446ء تک مختلف النوع خاندان کے لوگ دہلی پر قابض

ہوئے۔اس عرصے میں زبردست جنگ وجدال کے اوقات آئے۔دہلی پر متمکن ہر عہد کا بادشاہ کٹھیر کو بھی اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے مصروف رہا اور جنگ وجدال کرتا رہا۔اس عرصے میں 1320ء سے 1446ء تک ہر مرکزی حکومت نے اپنا ایک حاکم کٹھیر پر مقرر کیا اور آخری حاکم دریا خان تھا اس طرح 1446ء تک یہاں کل سولہ حاکم متعین ہوئے۔

1450ء میں مرکزی حکومت لودھی خاندان میں آئی۔1487ء میں خان خاناں لودھی کو کٹھیر کا انتظام دیا گیا۔ 1488ء میں دریا خان نے سلطان بہلول خان سے معافی مانگ لی جس کی وجہ سے اس کو پھر سے آگرہ اور کٹھیر کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔1490ء میں اس کا انتقال ہوا اس نے 45 سال کٹھیر پر حکمرانی کی۔اس کے بعد کٹھیر پر تین اور حکمران ہوئے۔

1526ء میں بابر نے ہندستان پر حملہ کیا اور فتح پائی۔اس وقت کے کٹھیر کے تیسرے حاکم محمد قاسم نے بابر کی اطاعت قبول کر لی۔1540ء میں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دیکر اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن 1555ء میں ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوا۔اس کی آمد سے پہلے تک سوری خاندان کی طرف سے کٹھیر پر 9 حاکم مقرر ہوئے۔البتہ ان میں ستھر سین 1552ء تا 1553ء کٹھیر کا خود مختار حاکم رہا۔

اور اس کے بعد 1556ء تا 1656ء تقریبا سو سال میں کٹھیر پر تیرہ حاکم مقرر ہوئے۔ان میں رستم خان 1627ء سے 1656ء تک کٹھیر کا نگراں رہا۔1656ء میں تخت دہلی کے لیے جب دارہ شکوہ اور عالمگری فوجوں میں جنگ ہو رہی تھی تو رستم خان دارہ شکوہ کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا۔1656ء میں نواب قاسم خان کو کٹھیر کا حاکم مقرر کیا گیا۔1661ء میں راجہ بکر مانندرائے کٹھیر کے حکمراں بنائے گئے انہوں نے بریلی کو دارالسلطنت بنایا۔1685ء میں عبدالوہاب امین الدولہ حاکم کٹھیر ہوئے اوران کا دارالسلطنت سنبھل تھا۔

1707ء میں جب اورنگزیب عالمگیر کا انتقال ہوا تو مغل حکومت کمزور ہوتی چلی گئی جس کی وجہ سے اس علاقہ میں کثرت سے موجود روہیلوں کو بھی ریاست قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔علی محمد خان روہیلہ جنھیں اپنے سرپرست داؤد خان سے دو جاگیریں وراثت میں ملی تھیں چنانچہ انھوں نے اپنی طاقت کے زور پر پہلے کٹھیر یہ راجپوتوں کو کنٹرول کیا اس کے بعد جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو مغلیہ حکومت میں اور کمزوری آئی جس کی وجہ سے علی محمد خان نے موقع کو غنیمت جان کر دیگر علاقوں کو ہدف بنایا اور بدایوں و سنبھل سرکار کے فوجداروں کو شکست دیکر تمام علاقے پر قبضہ کر لیا اور اس علاقہ کٹھیر کا نام بدل کر اپنے آبائی وطن کے نام پر روہیل کھنڈ رکھ دیا۔تا کہ کٹھیر یہ راجپوتوں سے اس علاقہ کا کوئی تعلق باقی نہ رہے اور روہیلوں کا حق ملکیت قائم ہو جائے۔نیز روہیلے اس علاقے کو اپنا وطن ثانی سمجھیں۔

روہیلہ اور روہیل کھنڈ کی وجہ تسمیہ:

لفظ روہیلہ سے مراد علاقہ ''روہ'' کے رہنے والے ہیں۔ روہ کوہستان کا وسیع سلسلہ ہے جو مشرق میں کشمیر سے لیکر مغرب میں ہرات تک اور شمال میں کوہ کاشغر سے لیکر جنوب میں بلوچستان تک پھیلا ہوا ہے۔

لسانی تقسیم کے اعتبار سے جس علاقہ میں پشتو بولی جاتی ہے وہی ملک روہ ہے پختو زبان کی نسبت سے روہیلوں کو پختون بھی کہا جاتا ہے اور یہی پختو لفظ پٹھان ہو گیا ہے۔ ملک روہ کی نسبت سے ہر مورخ نے نواب علی محمد خان کو روہیلہ لکھا ہے۔ اور اس علاقہ میں روہیلوں کے اجتماع کی وجہ سے پورے خطہ کو روہیلکھنڈ کہا جانے لگا۔

روہیلکھنڈ کا عروج وزوال:

اورنگزیب تک مغلیہ حکومت کافی مضبوط رہی لیکن جوں ہی 1707ء میں اورنگزیب کا انتقال ہوا تو مغلیہ حکومت میں ضعف پیدا ہونے لگا اور وہ رفتہ رفتہ بکھرنے لگی۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت نشیں ہوئے اور قتل کر دئے گئے ہندوستان بھر میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت 1739ء میں نادر شاہ نے دہلی کو لوٹ کر قتل عام کیا۔ صوبہ اودھ پر برہان الملک نے قبضہ کر لیا- حیدرآباد میں نظام الملک نے خودمختاری کا اعلان کر دیا- بہار، بنگال میں کئی سردار آزاد ہو گئے۔ دکن، گجرات اور مالو میں مرہٹوں نے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا۔ راج سنگھ والی جے پور نے آگرہ کا بڑا حصہ اپنے قبضہ میں لے لیا اور گجرات کا ایک بڑا علاقہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ غرض کہ مغلیہ حکومت کے کمزور ہونے کی وجہ سے سلطنت کے مختلف علاقے اس کی رسائی سے باہر ہوتے چلے گئے۔ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹنے لگا۔ حالات کو سازگار دیکھتے ہوئے اس علاقہ میں موجود روہیلوں کی مدد سے داؤد خاں نامی پٹھان نے اپنی قوت میں اضافہ کر کے دہلی کے بادشاہ سے دو جاگیریں حاصل کیں پھر اس کے جانشین علی محمد خان نے مزید علاقے فتح کر کے 1741ء میں ریاست روہیل کھنڈ کی بنیاد رکھ دی جو 1949ء میں اپنے اختتام کو پہنچی۔

کٹھیر میں روہیلوں اور داؤد خان کی آمد:

ہمایوں کی شکست کے بعد شیر شاہ سوری کے عہد حکومت تک دوسری بار روہیلوں کی کٹھیر میں آمد شروع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ لوگ شہاب الدین محمد غوری کے عہد حکومت میں یہاں آئے تھے۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک کے زمانے میں بھی یہ لوگ یہاں آتے رہے لیکن شمس الدین التتمش کے دور حکومت میں یہ لوگ کثرت سے یہاں آئے۔ اس طرح کٹھیر اور اس کے اطراف کو روہیلوں نے اپنا مسکن بنایا۔ یہاں یہ لوگ خشک میوے اور گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ اس زمانے میں گھوڑوں کی تجارت پٹھان تاجروں کا سب سے بڑا اور معزز پیشہ تھا۔ اس تجارت کے ذریعہ سرحد

سے پنجاب اور پنجاب سے آسام اور آسام سے انڈونیشیا تک پھیل گئے اور انڈونیشیا کو بھی اپنا وطن ثانی بنالیا۔ سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں بالعموم اور کٹھیر میں بالخصوص روہیلوں کا وجود علی محمد خان سے بہت پہلے پایا جاتا ہے۔ ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی تخت ہندوستان پر متمکن ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کی تقویت کی غرض سے افغانستان اور روہ میں عطوفت آمیز فرمان بھیج کر افغانوں کو طلب کیا، اس طلبی پر جوق جوق افغان ہندوستان میں آنا شروع ہو گئے۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں وہ نظر نہ آتے ہوں، جب تک سلطنت بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری کے خاندان میں رہی افغانوں کی آبادی ہندوستان میں برابر ترقی کرتی رہی۔'' ۴

شہاب الدین خاں عرف کوٹہ بابا علاقہ قندھار کے رہنے والے تھے۔ کوٹہ بابا صوفی صفت بزرگ اور ان کے سینکڑوں مرید تھے۔ یہ اٹک اور لنگر کوٹ میں آ کر بس گئے تھے۔ کوٹہ بابا کا انتقال چھ ہزارہ میں ہوا اور موضع شاہی میں دفن ہوئے۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک محمود خان عرف موتی بابا تھے۔ موتی بابا کے پانچ بیٹوں میں سے ایک شاہ عالم خان تھے۔ شاہ عالم خان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے انھوں نے ورثہ میں ملے ایک غلام داؤد خان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ داؤد خان 1707ء بہ اثنائے وفات اورنگ زیب عالمگیر کٹھیر میں داخل ہوئے۔ اس سنہ کے بعد 1708ء شاہ عالم خان کے یہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام حافظ رحمت خاں تھا۔ چنانچہ سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

''حافظ الملک کے جد امجد شہاب الدین المعروف کوٹا بابا ضلع اٹک اور لنگر کوٹ میں جا کر مقیم ہوئے۔۔۔ان کا مزار ہزارہ میں ہے۔ شہاب الدین کے تین بیٹے تھے۔ پائی خان، محمود خان اور آدم خان۔۔۔محمود خان نے پانچ بیٹے چھوڑے۔ آزاد خان، شہزاد خان، حکیم خان، حسن خان اور شاہ عالم خان۔۔۔ترکۂ پدری کی تقسیم کے وقت شاہ عالم خان کے حصہ میں ایک غلام داؤد خان نامی آیا کیونکہ اس وقت ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اسے اپنے بیٹے کی طرح پرورش کر کے خانہ داری اور زراعت کا جملہ کام اس کے سپرد کر دیا۔'' ۵

''شاہ عالم خان جب پہلی بار ہندوستان سے واپس وطن پہنچے تو اللہ تعالی نے ان کو ایک اقبال مند فرزند عطا کیا جن کا نام رحمت خان رکھا گیا اور جو بعد کو حافظ الملک کے نام سے مشہور ہوئے، تاریخ ولادت مستند تاریخوں میں ۱۷۰۸ء مذکور ہے وہ اپنے والد کی شہادت کے وقت چار سال کے تھے'' ۶

داؤدخان حجہ ہزارہ سے ہری دوار ہوتے ہوئے الموڑہ پہنچے۔الموڑہ کے بعد بن گڑھ کی ایک گڑھی میں سکونت اختیار کی۔ یہ بن گڑھ آنولہ اور بدایوں کے درمیان واقع ہے اس کو آج یوسف نگر کے نام سے جانا جاتا ہے۔شاہی حکومت کے کمزور ہونے کی وجہ سے کٹھیر میں ہر زمیندار خودسری کا دم بھرنے لگا تھا اکثر افغان جو یہاں آتے تھے یہ زمیندار اپنے یہاں ملازم رکھ لیتے اور ان کی بہادری کے بل بوتے پر باہم جنگ وجدال کرتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ان افغانوں کو استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں داؤدخاں نے بھی ان زمینداروں کی ملازمت کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مدارشاہ کی نوکری کی جو بدایوں سرکار پرگنہ کا زمیندار تھا۔ مدار سہائے کی جانب سے چومحلّہ پرگنہ کے زمیندار سے ایک جنگ کے دوران بانکولی گاؤں سے انہیں سات آٹھ سال کا ایک بچہ ملا جسے انہوں نے متبنٰی کر لیا۔اس کا نام علی محمد خاں رکھا۔کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ گمنام بچہ آگے چل کر اتنا بڑا نام پیدا کرے گا۔نواب سعادت یار خان لکھتے ہیں:

''جب داؤد خان جوان ہوا تو۔۔۔ ہندوستان آکر شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگزیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں ملک کٹھیر میں وارد ہوا۔۔۔داؤد خان ولایت کے دوسو افغانوں کے ساتھ بدایوں سرکار کے برسیر پرگنہ کے زمیندار مدار شاہ کے پاس نوکر ہوگیا،اوراس کی طرف سے پرگنہ چومحلّہ کے زمیندار کی جنگ پر جا کر فتح یاب ہوا،اور بانکولی وغیرہ مواضعات پر دھاوا بول کر مال واسباب اوراس دیہات کے مویشی اور زن وفرزند میں سے جو کچھ پایا سب مال غنیمت میں لے لیا، اور وہاں ایک سات آٹھ سالہ خوبصورت لڑکا بھی اس کے ہاتھ لگا۔۔۔اسے اپنی فرزندی میں لے کر علی محمد خان کے نام سے موسوم کیا'' ؎

داؤدخاں زمینداروں کی آپسی جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی طاقت میں اضافہ کرتے رہے ان کی بہادری اور دلیری کی وجہ سے اکثر افغان ان کے ساتھ جمع ہوگئے۔جن کی مدد سے انہوں نے زمینداروں کی سرکوبی کر کے ان پر اپنی طاقت کا سکہ بٹھا دیا۔اس عرصہ میں انہوں نے کئی زمینداروں کی ملازمت کی پھر مرادآباد کے شاہی فوجدار عظمت اللہ کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔اپنی بہادری کی وجہ سے فوج کے ایک دستہ کے رسالہ دار متعین ہوئے اور آخر کار انہیں اپنی جواں مردی دکھانے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔

واقعہ یوں ہے کہ اس وقت مغل دربار میں ہر روز نئی نئی سازشیں تیار ہوتی تھیں جس کے سرغنہ جانسٹھ (مظفرنگر) کے دوسید برادران سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں تھے۔انہیں بادشاہ گر کہا جاتا تھا جسے چاہا تخت پر بٹھا دیا جسے چاہا قتل کرا دیا۔ان کے برخلاف ترک امراء کا ایک گروہ تھا جو بادشاہ کو اپنے زیر اثر دیکھنا چاہتا تھا۔

1720ء میں سید برادران کے اکسانے پر محمد شاہ بادشاہ نے دکن پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔اس کے لئے اطراف ملک سے فوجیں طلب کیں۔عظمت اللہ خاں نے مراد آباد سے ایک فوج بھیجی جس میں داؤد خاں کا رسالہ شامل تھا۔اس مہم کے وقت سید عبداللہ خاں دہلی میں بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔اور سید حسین علی خاں بادشاہ کے ساتھ مہم پر روانہ ہو گیا تھا۔فوج ابھی آگرہ میں تھی کہ سید حسین کو اکیلا پا کر مخالف ترک امراء نے بادشاہ کی مرضی سے اسے قتل کر دیا۔سید حسین کے قتل کئے جانے کی وجہ سے اس کی فوج نے بغاوت کر دی۔ادھر دہلی میں سید عبداللہ خاں کو جب اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی تو وہ مرہٹوں کی فوج کی مدد لیکر بادشاہ سے مقابلہ کرنے آگرہ کی طرف بڑھا۔بادشاہ دہلی کی طرف روانہ ہوا آگرہ اور دہلی کے درمیان شاہ پورا میں 3 نومبر 1720ء کو دونوں فوجوں میں ٹکراؤ ہوا۔جس کے نتیجہ میں سید عبداللہ خاں کی فوج کو شکست ہوئی۔داؤد خاں کے دستے کا مقابلہ مرہٹہ کی ایک ٹکڑی سے ہوا۔اور داؤد خاں نے مرہٹہ جماعت کو شکست دیکر ان کا ہاتھی چھین لیا۔بادشاہ داؤد خاں کی اس بہادری سے بہت خوش ہوا اور تحفہ میں ان کو دو گاؤں ببولی پرگنہ ستاسی سرکار بدایوں اور موضع سراسی پرگنہ اجاوامیر گنج ضلع بریلی جاگیر میں عطا کیے۔

آگرہ سے واپس آکر داؤد خاں نے راجہ کمایوں کی ملازمت کر لی اور راجہ نے ان کے رسالہ کو رودرپور میں تعینات کر دیا۔اسی دوران ایک باغی شہزادہ اس علاقہ میں آکر فوج منظّم کرنے لگا جس میں راجہ کمایوں اس کی مدد کر رہا تھا۔عظمت اللہ خاں نے شہزادہ اور راجہ کمایوں کے خلاف فوج کشی کر دی۔داؤد خاں عظمت خاں کے دیرینہ تعلق کی بنا پر راجہ کمایوں کی حمایت سے الگ ہو گئے جس کے نتیجے میں راجہ کی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔داؤد خاں کی غداری سے راجہ ناراض تو بہت ہوا لیکن اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ پرانی تنخواہ دینے کے بہانے سے انہیں الموڑہ بلایا اور قید کر کے تمام ساتھیوں کے ساتھ انہیں قتل کرا دیا۔

بانی ریاست روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں:

جب داؤد خاں کو قتل کر دیا گیا تو سرداروں نے ان کے لے پالک بیٹے علی محمد خاں کو سردار مقرر کر لیا نیز عظمت خاں نے بھی ان کی سرداری کو قبول کر کے داؤد خاں کی جاگیریں ان کے سپرد کر دیں۔پرگنہ ستاسی عمدۃ الملک امیر خاں کی جاگیر میں تھا جس کے گاؤں دیہات مستاجری کی صورت میں راجپوت زمینداروں کے پاس تھے۔علی محمد خاں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ان دیہاتوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ان راجپوتوں میں آنولہ کا راجپوت زمیندار نہایت طاقت ور تھا جس کے پاس کافی علاقہ اور بڑی فوج تھی۔نواب علی محمد خاں نے آنولہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے نوکر کو لالچ دے کر اسی کے ہاتھوں راجہ کو قتل کروا دیا۔اور جب اس کے لڑکے اس کی آخری رسم ادا کر رہے تھے تو عین اسی وقت علی محمد

خاں نے حویلی پرحملہ کر کے اس پر اپنا قبضہ کرلیا۔ابھی علی محمد خاں نے آنولہ پر قبضہ کیا ہی تھا کہ عمدۃ الملک امیر خاں نے اپنے نائب محمد صالح خواجہ سرا کومنونہ بھیجا جو کہ آنولہ سے دومیل کے فاصلے پر ہے، یہ پرگنہ ستاسی کا صدر مقام تھا۔حکم دیا کہ علاقہ کے زمینداروں سے حساب کتاب کر کے رقم وصول کرے اوران سے یہ علاقہ خالی کرالے۔ چونکہ علی محمد خاں اس وقت علاقہ کے سب سے طاقت ور سردار تھے اس لئے وہ علاقوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ جب خواجہ سرا نے ضد کی تو علی محمد خاں نے عظمت اللہ خاں کے اشارہ پر اس کو قتل کر دیا،اور تمام ساز وسامان چھین لیا۔اس حملے میں ان کے ہاتھ بے شمار قیمتی سامان آیا اوران کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔نواب سعادت یار خان لکھتے ہیں:

''چند سال بعد محمد صالح نامی خواجہ سرا پرگنہ منونہ وغیرہ کا جاگیرداروں سے ٹھیکہ لے کر شاہجہاں آباد سے منونہ پہنچا اور پرگنہ مذکور کے عاملوں اور زمینداروں سے خاطر خواہ رقم وصول کی،اور علی محمد خان سے بھی دوبارہ اس کے مقبوضہ گاؤں کے چھوڑنے پر جھگڑا کیا۔۔۔علی محمد خان نے مجبور ہو کر پہلے عظمت اللہ خان کے پاس جا کر اظہار حقیقت کیا، وہاں سے در پردہ جنگ کی اجازت حاصل کر کے لوٹا۔۔۔اور خواجہ سرا کو اس کے ہمراہیوں سمیت قتل کر دیا،اوراس کے تمام اسلحے اور ساز وسامان پر قابض ہوکر پرگنہ منونہ کو بھی اپنے قبضہ میں لایا۔'' ۸

1730ء سے 1737ء تک نواب علی محمد خاں عظمت اللہ خاں کی حمایت سے علاقہ کے راجپوت زمینداروں پر حملہ کر کے ان کی جاگیروں پر قبضہ کرتے رہے۔اسی درمیان میں علی محمد خاں کی شہرت سن کر صوبہ سرحد سے کثرت سے پٹھان یہاں آئے اور علی محمد خاں کا رسالہ ایک بڑی فوج میں تبدیل ہو گیا۔

1738ء میں عظمت اللہ خاں کا انتقال ہو گیا اور 1739ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے وہاں قتل عام کیا۔ سرکاری خزانے اور رعایا کو لوٹ کر تخت طاؤس کو بھی لے کر چلا گیا۔اس افراتفری کے دور میں کوئی بادشاہی فوجدار نہیں تھا۔جس کے چلتے علی محمد خاں اپنی طاقت وقوت میں اضافے کرتے رہے۔آخر بادشاہ کو علی محمد خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش ہوئی۔عظمت اللہ کے انتقال کے بعد وزیر اعظم قمرالدین نے 1742ء میں ہرنند رائے کھتری کو پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ سنبھل سرکار کا فوجدار مقرر کر کے حکم دیا کہ علی محمد خاں کو علاقہ سے نکال دیا جائے اوراس کی مدد کے لئے اپنے بیٹے میر منو کو روانہ کیا۔علی محمد خاں نے جب یہ خبر سنی تو پہلے صلح کی کوشش کی لیکن جب صلح نہیں ہو پائی تو بیس ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ آنولہ سے نکلے اور راجہ ہرنند رائے کی فوج کے ساتھ دریائے ارل کے کنارے مقابلہ کر کے اس کی فوج کو شکست دے دی اور راجہ کو قتل کر کے امروہا، مرادآباد، سنبھل، شاہ آباد وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا۔میر منو راستے میں ہی تھا کہ اسے راجہ کی شکست کی خبر ملی لہٰذا وہ دارانگر میں ہی ٹھہر گیا۔نواب علی محمد خاں نے شاہی عتاب سے بچنے کے

لئے نواب محمد خاں بنگش کے وسیلے سے صلح وصفائی کی پیش کش کی جس کے بعد معاہدہ صلح ہو گیا۔اس معاہدہ کی رو سے سنبھل سرکار اور بدایوں سرکار کو ملا کر کل ملک کٹھیر کا صوبہ دار نواب علی محمد خاں کو بنا دیا گیا۔نواب علی محمد خاں نے کٹھیر کا نام بدل کر روہیل کھنڈ رکھ دیا اور آنولہ کو راجدھانی بنا کر تمام پرگنوں پر قبضہ کر کے اپنے عامل تعینات کر دیے۔ چنانچہ سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

> ''۱۷۴۲ء میں راجہ ہرنند کھتری نواب صاحب کی تادیب اور کٹھیر کے انتظام کے لیے مقرر کیا گیا۔راجہ ہرنند پچاس ہزار فوج کے ساتھ براہ سنبھل مراد آباد میں داخل ہوا۔ یہ خبر پا کر علی محمد خان نے ۔۔بیس ہزار پیادہ وسوار کی جمعیت کے ساتھ آنولہ سے کوچ کیا اور دریائے ارل کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔۔اس حملہ کو روکنے کے لیے راجہ چند ہی قدم بڑھا تھا کہ سینہ پر بان کی ضرب کھا کر مارا گیا۔۔بڑے بڑے سرداروں کے مارے جانے کے بعد راجہ کی تمام فوج بھاگ گئی۔نواب علی محمد خان نے ۔۔فتح کا شکرانہ ادا کیا۔۔اس فتح کے بعد نواب علی محمد خان نے شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور پرگنات ۔۔کو اپنے قبضہ وتصرف میں لے لیا۔'' ۹

1745ء میں محمد شاہ بادشاہ نے علی محمد خاں سے ناراض ہو کر ریاست پر چڑھائی کر دی۔علی محمد خاں نے کچھ حد تک دفاع کیا لیکن شاہی فوج سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا سکے اور اپنے آپ کو اپنے دونوں بیٹوں فیض اللہ خاں اور عبد اللہ خاں سمیت بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ انہیں گرفتار کر کے دہلی لے گیا بعد میں 1746ء میں انہیں رہا کر کے سرہند کا صوبہ دار بنا دیا۔1748ء میں جب احمد شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو بادشاہ کو نواب علی محمد خاں کی طرف سے اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ احمد شاہ سے مل جائیں لہذا انہیں روہیل کھنڈ واپس جانے کا حکم دے دیا۔احمد شاہ نے جب سرہند پر حملہ کیا تو وہاں نواب علی محمد خاں کے دونوں بیٹے فیض اللہ خاں اور عبداللہ خاں ہاتھ لگے جنہیں وہ اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔نواب علی محمد خاں سرہند سے تھوڑے بہت بیمار آئے تھے کہ بیٹوں کی گرفتاری سے ان کے مرض میں اور اضافہ ہو گیا اور 5 ستمبر 1749ء کو استسقاء کے مرض کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ ۱۰

روہیل کھنڈ کی تقسیم:

علی محمد خاں کے انتقال کے بعد بڑے بیٹوں عبداللہ خان اور فیض اللہ خان کی غیر موجودگی میں سرداروں نے نوعمر سعد اللہ خاں کو تخت نشیں کیا اسی اثناء میں حافظ رحمت خاں اور دوسرے سردار فیض اللہ خاں اور عبداللہ خاں کو رہا کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔1752ء میں جب احمد شاہ درانی نے پنجاب پر دوبارہ حملہ کیا تو اس موقع پر اس نے دونوں

بیٹوں کو روہیل کھنڈ جانے کی اجازت دے دی۔فیض اللہ خاں اور عبداللہ خاں کے واپس آنے کے بعد روہیل کھنڈ ریاست تقسیم ہوگئی۔اس تقسیم میں شاہ آباد بشمول رامپور نواب فیض اللہ خاں کے حصے میں آئے۔ بریلی، پیلی بھیت اور شاہجہاں پور حافظ رحمت خاں کو ملا۔مراد آباد، بسولی، سنبھل دوندے خاں کو۔ بدایوں فتح خاں خانساماں کو۔آنولہ اور اس سے متصل علاقے بخشی سردار خاں کو ملے۔حافظ رحمت خاں نے نواب سعداللہ خاں کو 8 لاکھ کی پینشن دے کر ریٹائر کر دیا۔ 1761ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

> ''احمد شاہ درانی قلعہ سرہند سے عبداللہ خان اور فیض اللہ خان پسران نواب علی محمد خان کو ہمراہ کو اپنے ہمراہ قید کر کے قندھار لے گئے تھے، جب سے یہ لوگ شاہ درانی کے پاس تھے۔حافظ الملک ہمیشہ ان کی رہائی کے لیے احمد شاہ درانی کی خدمت میں درخواستیں بھیجتے رہے۔۔۔احمد شاہ نے حافظ الملک کی درخواست منظور فرما کر عبداللہ خان اور فیض اللہ کو روہیل کھنڈ واپس جانے کی اجازت دے دی۔ ۱۱

1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پھر پنجاب کا رخ کیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست دی اور نجیب الدولہ کو دوبارہ دہلی لاکر امیر الامراء مقرر کر دیا۔ 1761ء میں پانی پت کی عبرتناک شکست کے باوجود مرہٹوں کے زخم نو سال میں مندمل ہو گئے۔انہوں نے 1770ء میں پھر دہلی کا رخ کیا لیکن نجیب الدولہ کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ مرہٹوں سے مقابلہ کرسکیں لہٰذا ان سے صلح کرنا مناسب سمجھا۔اس صلح میں طے پایا کہ 1751ء کے معاہدہ چلکیا کے 80 لاکھ روپئے احمد خاں بنگش والی فرخ آباد سے وصول کیے جائیں اور اگر یہ رقم نہ ملے تو اٹاوہ اور شکوہ آباد حاصل کرلیں۔مرہٹوں نے یہ شرط رکھی کہ نجیب الدولہ اس مہم میں ساتھ رہیں گے۔نجیب الدولہ اگرچہ بیمار تھے لیکن پھر بھی ان کو اس مہم میں ساتھ رکھا گیا جس کی وجہ سے راستے میں ہی ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے جنازہ کو نجیب آباد لے جایا گیا۔لیکن ان کے لڑکے ولی عہد ضابطہ خاں کو مرہٹوں نے اپنے ساتھ رکھا۔فرخ آباد اور اٹاوہ کو بچانے کے لئے حافظ رحمت خاں مدد کو آئے لیکن انہیں شکست ہوگئی۔اسی اثناء میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو انگریزوں سے بچا کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا اور ضابطہ خاں نجیب آباد چلے گئے۔اس کے بعد مرہٹوں نے نجیب آباد پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ضابطہ خاں وہاں سے بھاگ کر حافظ رحمت خاں کے پاس آگئے۔حافظ رحمت خاں نے روہیل کھنڈ کو بچانے کے لئے شجاع الدولہ سے مدد طلب کی۔نواب شجاع الدولہ نے 40 لاکھ روپئے کے عوض مدد کرنے کی شرط رکھی جسے حافظ رحمت خاں نے منظور کرلیا اور چالیس لاکھ کا تمسک لکھ کر اسے دے دیا۔لیکن مرہٹے واپس چلے گئے اور شجاع الدولہ کو مدد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔یہی چالیس لاکھ کا تمسک آگے چل کر روہیلوں کی تباہی کا سبب بنا۔ ۱۲

1773ء میں مرہٹوں نے دباؤ ڈال کر کڑہ کی جاگیر کی سند حاصل کرلی۔ یہ علاقہ الہ آباد کے قریب ہے اور اس وقت شجاع الدولہ کے قبضے میں تھا۔اس علاقہ پر مرہٹوں کو قبضہ دلانے کے لئے بادشاہ نے نجف خاں کو مرہٹوں کے ساتھ روانہ کیا۔مرہٹہ لشکر نے جب بدایوں میں رام گھاٹ کے پاس پڑاؤ ڈالا تو حافظ رحمت خاں یہاں پہنچے کیونکہ یہ علاقہ بخشی خاں کا تھا۔مرہٹوں نے حافظ رحمت خاں سے کہا کہ اگر آپ اودھ کو فتح کرنے میں ہماری مدد کریں تو ہم آپ کا چالیس لاکھ کا تمسک جو شجاع الدولہ کے پاس ہے آپ کے حوالے کردیں گے۔حافظ رحمت خاں نے مرہٹوں کو باتوں میں الجھایا اور شجاع الدولہ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم جلد از جلد یہاں آجاؤ اور میرا چالیس لاکھ کا تمسک واپس کردو تو میں اودھ بچانے کے لئے مرہٹوں سے جنگ کرنے کو تیار ہوں۔شجاع الدولہ نے جواب بھیجا کہ میں جلد از جلد پہنچ رہا ہوں اور اس درمیان تم مرہٹوں کو کسی طرح روکے رکھو۔تمسک کے بارے میں میں نے شاہ مدن سے کہہ دیا ہے وہ جو کچھ کہیں گے اسے میرا ہی قول سمجھنا میں اس کی پابندی کروں گا۔شاہ مدن نے حافظ رحمت خاں سے کہا کہ مجھے شجاع الدولہ نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ مرہٹوں کا قضیہ نمٹنے کے بعد آپ کا تمسک واپس کردیا جائے گا۔چنانچہ اس درمیان میں حافظ رحمت خاں نے مرہٹوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔یہاں تک کہ شجاع الدولہ انگریزوں کی فوج کے ہمراہ آگیا اور حافظ رحمت خاں اور شجاع الدولہ نے ملکر مرہٹوں کو بھگا دیا۔اب سوال تمسک واپس کرنے کا آیا تو شجاع الدولہ نے صاف انکار کردیا۔اور کہا کہ شاہ مدن سے میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔اور یہ کہ رام گھاٹ کی یہ جنگ روہیل کھنڈ کو بچانے کی تھی نہ کہ اودھ کو بچانے کی۔جبکہ حافظ رحمت خاں کا کہنا تھا کہ مرہٹوں نے اودھ پر چڑھائی کی تھی اور انہوں نے اودھ کو بچانے میں تعاون دیا تھا جس کے نتیجے میں دونوں کے مابین اس مسئلہ میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔

روہیل کھنڈ سے واپس جانے کے بعد شجاع الدولہ نے بنارس میں گورنر جنرل وارن سے ملاقات کرکے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کے لئے اکسایا۔اور بدلہ میں چالیس لاکھ کا نذرانہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔1774ء میں روہیل کھنڈ پر فوج کشی کے لئے شجاع الدولہ کو کرنل چمپین کی قیادت میں انگریزی فوج مل گئی۔اور زبردست تیاری کرکے وہ روہیل کھنڈ کی طرف چل پڑا بعد میں نواب مظفر جنگ والی فرخ آباد اور نواب ضابطہ خاں والی نجیب آباد کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔مزید یہ کہ بادشاہ دہلی نے بھی مدد کے لئے اپنے سپہ سالار نجف خاں کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کردیا۔اس طرح حافظ رحمت خاں کے خلاف ایک بڑا محاذ بنانے میں شجاع الدولہ کامیاب ہوگیا۔

کرنل چمپین نے روہیل کھنڈ کی سرحد پر پہنچ کر حافظ رحمت خاں کو کہلا بھیجا کہ روہیل کھنڈ کی حفاظت کے لئے شجاع الدولہ کا دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے یہ رقم ادا کردو ورنہ میں روہیل کھنڈ میں داخل ہوجاؤں گا۔حافظ رحمت خاں کو

چالیس لاکھ کے بجائے دو کروڑ کا نوٹس ملا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ان کو ختم کرنے کی سازش ہے مزید جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنی فوج لیکر شاہ جہاں پور کی طرف بڑھے اور کڑا میران پور پہنچے جہاں شجاع الدولہ اور انگریزی فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ حافظ رحمت خاں کے ساتھ نواب فیض اللہ خاں اور نواب نصر اللہ خاں وغیرہ تھے۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور گھمسان کی جنگ ہوئی۔ روہیلہ فوجوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن شجاع الدولہ کی کثیر فوج کے سامنے ٹک نہ سکیں۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور روہیلہ فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ نواب فیض اللہ خاں کچھ سرداروں کے ساتھ بھاگ کر لال ڈانگ میں مورچہ بند ہو گئے شجاع الدولہ تعاقب کرتے ہوئے لال ڈانگ پہنچا لیکن جنگل پہاڑ اور دلدل کی وجہ سے نواب فیض اللہ خاں پر قابو نہیں پا سکا۔

نواب فیض اللہ خاں ایک طرف مورچہ پر ڈٹے رہے اور دوسری طرف کرنل چیمپین سے صلح ومصالحت کے لئے خط وکتابت کرتے رہے آخر 7 اکتوبر 1774ء کو ایک معاہدہ کے تحت نواب فیض اللہ خاں کو ان کی جاگیر واپس مل گئی اور وہ رامپور واپس آ گئے۔ ١٣

نواب فیض اللہ خاں:

نواب فیض اللہ خاں 1732ء کو آنولہ میں پیدا ہوئے اور روہیل کھنڈ کی تقسیم کے بعد شاہ آباد رامپور کے حاکم بنے۔ نواب شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کے مابین جنگ میں حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد 7 اکتوبر 1774ء میں لال ڈانگ معاہدہ کی بدولت پندرہ لاکھ روپئے کی آمدنی کا علاقہ آپ کے تصرف میں آیا۔ رامپور کو ریاست کی راجدھانی بنا کر نظم ونسق کو درست کیا اور جنگ سے تباہ شدہ رعایا کو سہارا دیا۔ روہیل کھنڈ کے ہر طرف کے رئیس ورئیس زادے جوان کے پاس آئے سب کو آسرا دیا۔ نواب زادوں کی نوابین اودھ سے جاں بخشی کرائی اور حسب حیثیت وظیفہ مقرر کیا۔ نواب فیض اللہ خان کے حسن انتظام سے تھوڑے ہی دنوں میں پندرہ لاکھ آمدنی کی ریاست بائیس لاکھ آمدنی والی ریاست بن گئی۔ مولوی نجم الغنی مولوی قدرت اللہ شوق کی جام جہاں نما کا حوالہ دیتے ہوئے نواب صاحب کے حالات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''نواب صاحب کی نیک نیتی سے ان کا تمام علاقہ سرسبز وآباد ہے، اور سپاہ ورعایا شاد ہے۔ دین کے کاموں کا رواج جس قدر ریاست رامپور کی حدود کے اندر ہے اس کا دسواں حصہ بھی کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔'' ١٤

اور دیوان منولال فلسفی دہلوی کی کتاب جغرافیہ موسوم مساکن فلسفی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نواب سید فیض اللہ خاں کی سرکار میں پانچ سو علماء کو وظیفے ملتے تھے جو طلبہ کو پڑھاتے تھے اس زمانے میں علم کی بڑی رونق تھی۔ چنانچہ رامپور بخارائے ہندی کہلاتا تھا۔'' ۱۵

نواب صاحب کے عہد میں مسجدیں بکثرت تعمیر ہوئیں۔ جامع مسجد قدیم انہیں کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ نہایت متقی و جری انسان تھے۔ معاہدہ لال ڈانگ کے بعد بیس سال حکومت کی 64 سال کی عمر میں 1794ء میں انتقال ہوا اور رامپور میں عیدگاہ دروازہ کے پاس دفن ہوئے۔

نواب محمد علی خان:

1794ء میں نواب فیض اللہ خاں کے انتقال کے بعد انکے بڑے بیٹے نواب محمد علی خاں تخت نشیں ہوئے۔ جب آصف الدولہ کو معلوم ہوا کہ نواب فیض اللہ خاں کا انتقال ہو گیا تو اس نے نواب محمد علی خاں کو لکھنؤ طلب کیا۔ یہ لکھنؤ جانے کے لئے تیار ہو گئے لیکن تمام سرداران فوج اور بھائی بندان کے خلاف تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ نواب آصف الدولہ انہیں گرفتار کر کے ریاست ضبط کر لے گا۔ لیکن سب لوگوں کے کہنے کے باوجود انہوں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا اس کے علاوہ تمام سرداران کے برے برتاؤ اور سخت مزاجی سے ناراض تھے اور ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی غلام محمد خاں کو نواب بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک سازش کے تحت انہیں قتل کر دیا گیا اور نواب محمد یار خان کے مقبرے کے جنوب میں دفن ہوئے۔ انہوں نے کل پچیس روز حکومت کی تھی۔

نواب غلام محمد خاں:

نواب محمد علی خاں کے قتل کے بعد سرداروں نے نواب غلام محمد خاں کو تخت پر بٹھا دیا۔ ادھر نواب آصف الدولہ اور انگریز گورنر جنرل کے سامنے نواب محمد علی خاں کے قتل کا استغاثہ پیش ہوا چونکہ ریاست رامپور انگریزوں کی وساطت اور ضمانت سے تھی لہٰذا ان کی منظوری کے بغیر یہ تاج پوشی غلط تھی تو نواب آصف الدولہ اور انگریز حکام نے نواب غلام محمد خاں کی جانشینی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف فوج کشی کر دی نواب آصف الدولہ کی فوج انگریزی فوج کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے بریلی تک پہنچی ابتدا میں نواب غلام محمد خاں جنگ سے بچنا چاہتے تھے اور اس کے لئے حکومت سے دستبردار ہونے کو بھی تیار تھے لیکن فوج کے سرداروں نے جب ان پر اعتماد اور ان کی حمایت کرنے کا مکمل

یقین دلایا تو نواب غلام محمد خاں بھی اپنی فوج آراستہ کر کے بریلی کی جانب روانہ ہوئے۔

۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء بروز جمعہ گنگا کے مغربی کنارے پر دونوں فوجوں میں ٹکر ہوئی شروع میں روہیلہ فوج کا پلڑا بھاری رہا اور فتح کی خوشی میں نوابی فوج بے قابو ہو کر مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئی لیکن اچانک انگریزی فوج نے توپوں کا رخ بدل کر پھر جو نئے سرے سے گولہ باری کی تو نقشہ ہی بدل گیا اور روہیلہ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے آخر کار روہیلوں کو شکست ہو گئی اور نواب غلام محمد خاں کو مجبوراً رامپور واپس ہونا پڑا۔ یہاں سے اپنے خاندان کو لے کر پہاڑ پر فنا چور مقام پر چلے گئے انگریزوں اور اودھ کی فوجوں نے ان کا تعاقب کیا لیکن وہ ان کی گرفت سے محفوظ رہے تھک ہار کر یہ فوجیں رامپور واپس لوٹ آئیں آخر کار چھوٹے موٹے ہنگاموں اور صلح و مصالحت کے بعد نواب غلام محمد خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا انہیں گرفتار کر کے بنارس بھیج دیا گیا ان کی جگہ نواب محمد علی خاں کے لڑکے نواب احمد علی خاں کو ریاست کی گدی پر بٹھایا گیا۔ اس وقت نواب احمد علی خاں کی عمر ۹ سال کی تھی اس لئے ریاست کے انتظام کے لئے نواب سید نصر اللہ خاں کو ریاست کا مدار المہام مقرر کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد انگریزوں کی اجازت سے نواب غلام محمد خاں زیارت حرامین شریفین کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے کابل میں احمد شاہ درانی کے لڑکے زماں شاہ کے پاس ٹھہرے پھر پنجاب میں نادوں کے راجہ سنسار چند کے ہاں مقیم ہوئے اور وہیں تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۸۲۳ء میں انتقال ہوا اور نادوں میں ہی دفن ہوئے۔ ۱۶

نواب احمد علی خاں:

نواب غلام محمد خاں کے معزول کئے جانے اور ان کے ترک وطن کے بعد نواب آصف الدولہ نے نواب فیض اللہ کے مقبوضہ علاقہ کا نصف حصہ اور تین لاکھ اکیس ہزار مہر طلائی لے کر صرف دس لاکھ آمدنی کا علاقہ نواب احمد علی خاں کو دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت ان کی عمر 9 سال کی تھی اس لئے نواب سید نصر اللہ خاں کو ریاست کا نائب مقرر کیا گیا۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی نے پھر انگریزوں کو باور کرایا کہ نواب فیض اللہ خاں کے لڑکے شر و فساد کا ارادہ کرتے ہیں لہٰذا انہیں لکھنؤ طلب کر لیا گیا۔ لیکن ڈیڑھ سال لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد جب انگریزوں کو ان کی بے گناہی کا یقین ہوا تو انہیں رامپور جانے کی اجازت دے دی۔ ۱۸۱۰ء میں جب نواب نصر اللہ خاں انتقال ہو گیا تو نواب احمد علی خاں کو مکمل اختیار حاصل ہو گیا اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ لیکن انہیں حکومت کے نظم و نسق سے زیادہ عیش و عشرت اور سیر و شکار سے دلچسپی تھی۔ ان کے عہد میں ریاست کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بدنظمی کی وجہ سے

ہزاروں لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے ناموافقت کی وجہ سے خاندان کے اکثر لوگ بھی رامپور سے باہر چلے گئے اور نواب غلام محمد خاں کے بیٹے نواب محمد سعید خاں نے انگریزوں کی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کی نوکری اختیار کر لی۔نواب احمد علی خاں نے ۴۶ سال حکومت کی اور ۱۸۴۰ میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۷؎

نواب محمد سعید خاں:

نواب احمد علی خاں کا کوئی نرینہ وارث نہ تھا لہذا انگریزی حکومت نے نواب غلام محمد خان کے بیٹے نواب محمد سعید خان کو والی ریاست تسلیم کر کے ۱۸۴۰ء میں مسند نشین کر دیا۔نواب محمد سعید خان ایک قابل مدبر اور منتظم حکمران تھے۔ انگریزی ملازمت کی وجہ سے انہیں انتظام کا عملی تجربہ تھا اس لئے ریاست کی باگ ڈور سنبھالتے ہی انہوں نے ریاستی انتظام کو چست اور درست بنانے کی طرف توجہ دی۔نواب احمد علی خاں کے دور حکومت میں ریاست کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی حکومت کا یہ حال تھا کہ دس دس روپئے کے ملازم مال گزاری وصول کرنے پر مامور تھے عدالت میں مفتی قاضی تو تھے لیکن مقدمہ کا کوئی رجسٹر نہیں تھا کھڑے کھڑے صرف قسموں پر فیصلے ہوجایا کرتے تھے۔ملک کا نہ تو کوئی ضابطہ آئین تھا اور نہ کوئی دستور۔لہذا نواب صاحب نے ریاست کے کل نظام کو باضابطہ کیا۔مالی بدنظمی کی وجہ سے ریاست کی جو آمدنی گھٹ گئی تھی جدید مالی انتظام کی بدولت ریاست کی آمدنی میں اضافہ کیا۔اس کے علاوہ متعدد شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں،سڑکیں کشادہ کرائیں،بازار بنوائے اور گلی کوچوں کی صفائی ستھرائی کا انتظام کیا۔

۱۸۵۱ء میں جب لارڈ ڈلہوری رامپور آئے تو نواب کے حسن انتظام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت نواب یوسف علی خاں کو ولی عہد نامزد کر دیا۔کتب خانہ رامپور جسے نواب فیض اللہ خاں نے قائم کیا تھا نواب صاحب نے دوسرے محکموں کی اصلاح کے ساتھ اس کی جانب بھی توجہ دی،توشہ خانے میں کتابوں کے لئے جداگانہ کمرہ مقرر کیا، کتابوں پر ثبت کرنے کے لئے مہر کندہ کرائی،جس پر یہ شعر کندہ تھا۔

ہست ایں مہر بر کتب خانہ
والی رامپور فرزانہ

انھوں نے پرانی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ نایاب کتابوں کی نقلیں کروائیں اس مقصد کے لیے انھوں نے کشمیر سے مرزا غلام رسول اور مرزا احمد حسن دو بھائیوں کو طلب کیا۔ان کے علاوہ لکھنؤ سے میر عوض علی کو طلب کیا ان خطاطوں کی وجہ سے شہر میں گھر گھر خطاطی کا شوق پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ سینکڑوں خوش نویس مصروف کار نظر آنے لگے۔نواب سعید خاں

کا اکہتر سال کی عمر میں ۱۸۵۵ء میں انتقال ہوا۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلے سنیوں نے نماز جنازہ پڑھی پھر شیعوں نے نماز جنازہ ادا کی دونوں ہی یہ سمجھتے تھے کہ نواب صاحب ان کے مسلک کے ہیں۔ [۱۸]

اخبار الصنا دید ج ۲ ص ا سے ۲۰ تک

نواب یوسف علی خاں:

نواب یوسف علی خاں 1816ء میں پیدا ہوئے اور باپ کی زندگی ہی میں ولی عہد نامزد ہو گئے تھے۔ پھر ان کے انتقال کے بعد ریاست کے حکمران ہوئے اور ریاست کو مستحکم کرنے میں خصوصی توجہ دی لیکن ابھی تھوڑا ہی وقت ہوا تھا کہ 1857ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس موقع پر انہوں نے نہایت سمجھ بوجھ سے کام لیا اور ریاست کو ہنگامہ سے بچائے رکھا نہ صرف رامپور بلکہ مراد آباد کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے کر بغاوت کی آگ کو ٹھنڈا کیا بریلی اور نینی تال میں پھنسے انگریز افسروں کی مدد کی۔ سنبھل، حسن پور اور ٹھاکر دوارہ کے انقلابیوں کی سرکوبی کی اسی طرح امروہہ میں بدنظمی ہوئی تو نوابی فوج نے وہاں جا کر امن وامان قائم کیا۔ اس کے علاوہ نہ صرف روہیل کھنڈ بلکہ دلی تک کے ہنگامے کی خبر رسانی کا پختہ انتظام کر کے انگریزی حکومت کی حمایت اور وفاداری کا پورا ثبوت دیا۔ چنانچہ جب ہنگامہ فرو ہوا تو انگریزی حکومت نے ان کا بھرپور شکریہ ادا کیا اور مراد آباد و بریلی کے چند علاقے بطور انعام عطا کئے اور ہنگامہ کے دوران جو اخراجات ہوئے تھے ان سب کی ادائے گی گورنمنٹ نے کی۔ 1861ء کو انہیں ملکہ برطانیہ کی طرف سے اسٹار آف انڈیا کا خطاب عطا کیا گیا اور 1864ء کو امپیریل لجسلیٹو کونسل (Imperial legislative council) کا ممبر نامزد کیا گیا۔ نواب یوسف علی خاں ایک اعلی مدبر اور منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علم دوست اور علم پرور انسان بھی تھے۔ 1857ء کے ہنگامے میں دلی اور لکھنؤ سے اجڑے ہوئے صاحبان علم ان کے دربار میں پہنچے تو انہوں نے نہایت پرتپاک انداز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ لہٰذا ان کی فراخ دلی دیکھ کر ملک کے کونے کونے سے آ کر کثیر تعداد میں علماء، ادباء اور شعراء ان کے دربار میں جمع ہو گئے۔ انھیں خود بھی شاعری کا شوق تھا اور ناظم تخلص استعمال کیا کرتے تھے۔ پہلے مومن، پھر غالب اور آخر میں مظفر علی اسیر لکھنوی سے کلام پر اصلاح لی۔ کتابوں سے بے حد دلچسپی تھی نادر الوجود کتابیں جمع کرنے اور نقلیں کرانے کا شوق تھا۔ 1865ء کو کینسر کے مرض میں انتقال ہوا۔ [۱۹]

نواب کلب علی خاں:

نواب کلب علی خاں 1865ء میں تخت نشین ہوئے ان کا عہد ریاست کا سنہری دور کہلاتا ہے ان کے عہد میں ریاست مستحکم اور رعایا خوش حال تھی عدل وانصاف کا بول بالا تھا دربار میں ہر علم وفن کے صاحب کمال جمع تھے۔انھوں نے مال گزاری اور مستاجری کا نیا نظام جاری کیا، پولیس وفوج کو جدید طرز پر مسلح کیا، تعلیم کی طرف توجہ دی، جدید اسکول و مدرسے قائم کئے، نئی عمارتیں قائم کروائیں۔انگریزی سرکاران کے حسن نظام سے بہت خوش تھی چنانچہ 1866ء میں انھیں امپیریل لجسلیٹو کونسل (Imperial legislative council) کا ممبر نامزد کیا گیا۔1870ء میں ڈیوک آف ایڈنبرا سے ملنے آگرہ گئے تو پورے اعزاز کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔پھر 1873ء میں جب شہنشاہ ایڈورڈ جو اس وقت ولی عہد تھے، ہندوستان آئے تو انہوں نے آگرہ بلا کر نواب صاحب کو گرینڈ کمانڈر آف انڈیا کا خطاب عطا کیا۔اس کے بعد انہیں دربار قیصری سے مشیر قیصر ہند کے اعزاز سے نوازا۔

نواب صاحب کی سخاوت اور فیاضی کے بہت چرچے تھے ان کے وقت میں بڑے بڑے لوگ ریاست میں آئے اور ان کی تعریف کئے بغیر نہیں گئے۔1872ء میں حج کرنے گئے تو وہاں بھی عربوں کو اپنی فیاضی کا گرویدہ کرلیا۔فلاحی کاموں میں دل کھول کر امداد کرتے تھے۔تین لاکھ کے خرچے سے نہر زبیدہ کی مرمت کروائی، ڈیڑھ لاکھ روپیہ جامع مسجد کی مرمت کے لئے دیے، روم وروس کی جنگ میں لاکھوں روپیہ سے مدد کی اور عام خیراتی کاموں میں کوئی جماعت اور سوسائٹی ایسی نہ تھی جس کی نواب صاحب نے مدد نہ کی ہو۔نواب کلب علی خاں صوم وصلوٰۃ کے پابند نہایت متقی مذہبی اور سچے مسلمان تھے۔علم وفضل میں تمام نوابوں پر فوقیت رکھتے تھے۔علم وادب کی سرپرستی میں اپنے خاندان میں سب سے بڑھ کر تھے۔چنانچہ نجم الغنی لکھتے ہیں:

> ''اس ریاست کو سو برس سے زیادہ ہوئے اس مدت میں ایک بھی رئیس ایسا نہیں گزرا جو فضل و کمال کے شوق میں نواب کلب علی خاں کی شان یکتائی کا حریف ہوسکتا تھا۔افسوس یہ ہے کہ ریاست کے انتساب نے ان کو نوابوں کے پہلوں میں جگہ دی ورنہ شاعری، تاریخ، ادب، موسیقی اور فقہ کی کون سی بزم ایسی ہے جہاں فخر وشرف کے ساتھ ان کو جگہ نہیں دی جاتی'' [۲۰]

مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

> ''۱۸۶۵ء میں نواب سید کلب علی خاں نے مسند ریاست پر قدم رکھا تو چند سال کے اندر رامپور بغداد اور قرطبہ کا ہم پلہ بن گیا۔خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) اپنے خاندان میں سرپرستی علم وادب کے لحاظ سے یکتا تھے۔بچپن سے کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔اور جب کوئی اچھا نسخہ ہاتھ آجاتا تو اس پر بقید تاریخ لکھا کرتے تھے، کہ مجھے ایسی خوشی میسر آئی ہے

کہ اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی ان کے عہد میں کتب خانہ (کتب خانہ سرکاری موجودہ رضا لائبریری) اپنی ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا تھا۔ خلد آشیاں کی قدردانی دیکھ کر ہندوستان کے گوشے گوشے سے کتابیں برسنا شروع ہوگئیں اور چند سال کے اندر اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ انھیں اس کیلیے نئی عمارت تعمیر کرانا پڑی۔'' [21]

نواب کلب علی خاں کا 53 سال کی عمر میں 1887ء میں انتقال ہوا اور شاہ جمال کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔

نواب مشتاق علی خان:

نواب مشتاق علی خاں 1857ء کو پیدا ہوئے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے۔ اگرچہ ان کا عہد حکومت بہت مختصر رہا لیکن ریاست کی ترقی کے کئی اہم اور یادگار کام ان کے دور میں انجام دیئے گئے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد انہوں نے ریاست کے انتظام کے لیے ایک کونسل قائم کی، جس میں نادر شاہ خاں، اصغر خاں، عبداللہ خاں اور پنمسیری داس کو ممبر نامزد کیا گیا اور جنرل اعظم الدین خاں کو مدارالمہام مقرر کیا گیا۔ خاندانی معاملات کے تصفیہ کے لیے پانچ ممبروں پر مشتمل مزید ایک کونسل تشکیل دی۔ ہندوؤں کے لیے ان کے پرسنل لا کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے ایک پنچایت مقرر کی جس میں صرف ہندو ممبر تھے۔ زیارت گاہ و مساجد کی دیکھ بھال و مرمت کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی اور دینی علماء کو اس کا ممبر نامزد کیا گیا۔ مدرسہ عالیہ کے تعلیمی نصاب میں اصلاح کی اور اس میں مضامین کا اضافہ کیا۔ دینی تعلیم کے لیے مزید مدرسے قائم کیے اور انگریزی تعلیم کے لیے اسکول کھولے۔ پہلے سے چلے اسکولوں کو اور بھی ترقی دی۔ مستاجری اور مال گزاری کے قوانین میں اصلاح کی جس سے ریاست کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ محکمۂ قانون میں تبدیلی کرتے ہوئے دیوانی اور فوجداری کی نئی عدالتیں قائم کیں۔ دفتروں میں فارسی زبان کی جگہ اردو زبان رائج کی۔

نواب مشتاق علی خاں کے عہد سے انگریزی طرز تعمیر کی ابتدا ہوئی۔ انھوں نے مسٹر رائٹ کو طلب کر کے چیف انجینئر مقرر کیا جس نے اصطبل اور مہمان خانے کی عمارتیں تعمیر کیں۔ بعد میں نواب حامد علی خاں کے عہد میں اور کئی عمارتیں تعمیر کیں، جس میں حامد منزل کی شاندار عمارت بھی ہے۔ اس عمارت کا طرز تعمیر دیکھ کر لوگ حیرت کرتے ہیں۔ چونکہ نواب صاحب اکثر بیمار رہتے تھے اس لیے سر آکلینڈ کالون لیفٹیننٹ گورنر نے رامپور آکر ریاست کے

انتظام کے لیے ایک کونسل انتظامیہ قائم کی اور نواب صاحب کو پریذیڈنٹ، جنرل اعظم خاں کو وائس پریذیڈنٹ اور کنور لطف علی خاں رئیس چھتاری اور سید آل حسن کو کونسل کا ممبر نامزد کیا۔نواب صاحب نے کل 27 مہینے حکومت کی۔اور 25 فروری 1889ء کو بحالت علالت انتقال ہوا۔اور حافظ شاہ جمال اللہ کے مقبرے کے احاطے میں دفن ہوئے۔

نواب حامد علی خاں:

نواب حامد علی خاں 1875ء میں پیدا ہوئے اور والد کے انتقال کے بعد چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔نواب مشتاق علی خاں کے عہد میں ریاست کے انتظام کے لئے ایک کونسل قائم کی گئی تھی نواب حامد علی خاں کی تخت نشینی کے وقت اس کا نام بدل کر کونسل آف ریجنسی کر دیا گیا اور سید صفدر علی خاں پرذیڈنٹ اور جنرل اعظم علی خاں وائس پرذیڈنٹ مقرر ہوئے۔کپتان کالون کو نواب صاحب کا اتالیق مقرر کیا گیا اور تعلیم کے لئے انہیں کپتان کے ساتھ بریلی اور نینی تال بھیج دیا گیا۔

1891ء میں جب جنرل اعظم الدین کو قتل کر دیا گیا تو ان کی جگہ میجر ونسنٹ کو بھیجا گیا میجر نے آتے ہی جنرل کے قتل میں ملوث لوگوں کو گرفتار کیا اور سزا دلوائی۔1893ء کو نواب صاحب نے یوروپ کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران انھوں نے برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ، شہزادہ ولی عہد اور دوسرے شاہی ممبران سے ملاقات کی۔اس سفر سے ان کے تجربے اور معلومات میں کافی اضافہ ہوا جسے انہوں نے بڑی تفصیل سے اپنے سفرنامے میں بیان کیا ہے۔

وہاں سے واپس آکر نواب جاورہ کی بہن سے نہایت دھوم دھام سے شادی کی۔1894ء میں سر چارلس کراسٹیٹ لفٹنٹ گورنر نے انہیں ریاست کا اختیار دیا اور مدد کے لئے ایک کونسل بنائی اور اس کونسل کے پرذیڈنٹ نواب صاحب کو اور وائس پرذیڈنٹ صاحب زادہ حمید الظفر کو مقرر کیا۔اور نواب محمد علی رئیس جہانگیر آباد کو ریونیو ممبر، خاں بہادر زین العابدین کو جوڈیشنل ممبر اور خاں بہادر عبدالمجید خاں کو کونسل کا سکریٹری نامزد کیا۔صاحب زادہ عبدالصمد خاں نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری اور مولوی فرخی میر منشی مقرر ہوئے۔

1896ء میں انگریزی حکومت نے انھیں مکمل اختیار دے دیا اس لئے بعد میں انھوں نے کونسل برخواست کر کے مدارالمہام کے عہدے کو ختم کر دیا اور ہر محکمہ کے لئے جدا جدا سکریٹری مقرر کئے۔جنہیں اپنے محکمے کے مکمل اختیار حاصل تھے۔صاحب زادہ عبدالصمد کو چیف سکریٹری مقرر کیا اور ریاست کے تمام عمور کی نگرانی براہ راست خود کرنے لگے جس کی وجہ سے ریاست نے کافی ترقی کی۔نواب حامد علی خاں ایک قابل حکمراں تھے ان کے حسن انتظام اور قابلیت کی

بناء پر برٹس حکومت نے انہیں متعدد اعزازات سے نوازا تھا۔نواب حامد علی خاں کو تعلیم و تعمیر سے خصوصی دل چسپی تھی مدرسہ عالیہ اور دیگر اسکولوں کو ترقی دینے کے ساتھ قصبات و دیہات میں میں کثیر تعداد میں مدارس اور اسکول قائم کئے تعلیمی وفلاحی اداروں کی مدد کرنے میں فراخ دل تھے۔علی گڑھ کالج کو ایک بار ایک لاکھ کی گرانٹ دی تھی یہ کالج جب یونیورسٹی بنا تو دو لاکھ روپے دیئے۔انجمن حمایت اسلام پنجاب مدرسہ عربیہ دیوبند اور مدرسہ طبیہ کالج دہلی کو مالی مدد ان کی فیاضی اور کشادہ دلی کی عمدہ مثال ہے۔تعمیرات کے سلسلے میں نواب حامد علی خاں کی مثال شاہجہاں سے دی جاتی ہے قلعہ کے اندر حامد منزل، رنگ محل، مچھلی بھون، مہمان خانہ انگریزی، مہمان خانہ ہندوستانی، کتب خانے کی عمارت، چیف سیکریٹری کا دفتر اور امام باڑہ وغیرہ۔قلعہ سے باہر می عمارتیں مثلاً کچہری، صدر عمارت عدالت، اسکول کوتوالی، جامع مسجد، اسپتال، فیل خانہ، اصطبل اور فراش خانہ وغیرہ۔باہر کی عمارتیں جیسے کوٹھی بے نظیر، خاص باغ، کوٹھی خسرو باغ، شہباد پیلیس جیسی شاندار عمارتوں کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر عمارتوں سے ان کی دل چسپی کا انداۃ کیا جاسکتا ہے۔خاص طور پر حامد منزل کی بناوٹ، بلندی، اندرونی سجاوٹ، گیلری میں نصب مجسمے، دربار ہال کی سنہری سجاوٹ، جھاڑ فانوس، کھڑکی، دروازے، دروازے کے منقش شیشے، کشادہ کمرے، کمروں میں ہوا کے گزرنے اور کمرے کو گرم رکھنے کے انتظام کو دیکھ کر کوئی بھی شخص تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔نواب صاحب کو اگر ایک طرف سیر وسیاحت کا شوق اور مختلف ریاستوں کے حکمرانوں ملک کے باہر بڑی بڑی شخصیات سے تعلقات بنانے کا جزبہ تھا تو دوسری طرف مہمان نوازی میں بھی ان کی مثال ملنی مشکل تھی۔نواب صاحب کا 1930ء میں انتقال ہوا۔ ۲۲

نواب رضا علی خان:

نواب رضا علی خاں 1906ء میں پیدا ہوئے والد کے انتقال کے بعد 1931ء میں ریاست کے حکمراں ہوئے۔انھوں نے اپنے ہر محکمہ میں جدت پیدا کی اور ریاست کے انتظام کو برٹش گورنمنٹ کے طرز پر ڈھالنے میں کافی دل چسپی لی۔نواب صاحب نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالتے ہی عوام کے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے نیا دستور بنایا۔جس میں لوگوں کو ملکیت اور اظہار رائے کی آزادی کا حق اور پریس کی آزادی کی ضمانت دی گئی اور ساتھ ہی اس بات کی یقین دھانی بھی کرائی گئی کہ کسی بھی شخص کو علاقہ، ذات، قوم یا مذہب کی بنیاد پر اس کو بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔دستور میں لوکل انتظامی، ادارے، میونسپل، بورڈ، ٹاون ایریا اور پنچایت کو قائم کرنے کی تجویز شامل تھی۔اس کے علاوہ تعلیمی، معاشی، صنعتی طور پر ہر شخص کو اپنی مرضی اپنی محنت اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ترقی کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

انھوں نے حکومت میں جمہوری طرز نظام کی حوصلہ افزائی کی۔ ریاست کی ایک لجسلیٹو کونسل بنائی جس کے 54 ممبران تھے۔اس میں سے 31 ممبران کو عوام نے منتخب کیا اور 23 ممبران حکومت کی طرف سے نامزد کئے گئے۔ انتخاب کے بعد نو منتخب مجلس کے ممبران نے ایک نیا دستور پاس کیا جس میں آزاد عدلیہ، آزاد محکمہ آڈٹ اور پبلک سروس کمیشن بنانے کی سفارش کی گئی۔ نئے ہاؤس، نئے صدر اور نائب صدر کا انتخاب براہ راست کیا اور کیبنٹ تشکیل دی گئی۔ ہر ٹیم ایک چیف منسٹر اور پانچ منسٹروں پر مشتمل تھی بعد میں اتفاق رائے سے اس میں مزید چار ممبر اور شامل کئے گئے۔ نئے دستور کے ذریعہ جدید انتخابی حلقے طے کئے گئے جس میں دو حصے تھے جنرل اور اسپیشل۔ جنرل حلقہ انتخاب میں شہر، قصبات و دیہات سے ممبران کو چننے کا انتظام تھا اور اسپیشل زمرے میں فیکٹری کے ملازمین، تاجران، جاگیداران و معافی داران میں سے ممبران منتخب ہوتے تھے۔ عدالتی نظام کو اور بھی قابل اعتماد بنانے کے لئے اس کی از سر نو ترتیب ہوئی۔ عوام کو عدالتوں پر مکمل بھروسہ کرنے اور انہیں صحیح انصاف دلانے کی غرض سے جوڈیشنل منسٹر کے ماتحت مختلف قوانین جیسے قانون تعزیرات رامپور، ضابطہ فوجداری، ضابطہ دیوانی، قانون اسلحہ، قانون مطالبات دفینہ، قانون کورٹ فیس، قانون اسٹامپ، قانون معاہدہ، قانون شہادت، قانون بیع مال، قانون انتقال جائداد، قانون میعاد سعادت، قانون داورسی خاص اور قانون میونسپلٹی وغیرہ تیار کرایا اور انھیں نافذ کیا۔ میونسپلٹی نظام میں اصلاح کی جس میں سرکاری ملازمین کے علاوہ عوامی انتخاب کے ذریعہ ممبران منتخب ہوتے تھے۔ ہسپتال وشفاخانے کی طرف توجہ دی، قابل ڈاکٹروں کا تقرر کیا، ہسپتال میں ضرورت کے مطابق ضروری دوائیں وآلات فراہم کئے۔ بنیادی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے متعدد اسکول قائم کئے۔ پولیس اور فوج کو جدید طرز پر منظّم کیا، ان کی ٹریننگ کے لئے اسکول قائم کیے، مزید ٹریننگ کے لئے انہیں انگریزی کیمپ میں بھیجا گیا۔ محکمہ مالیات کے لئے جدید اصول وضوابط بنائے ایک انگریزی فائنینشیل وزیر کے ماتحت ٹریڈا کاؤنٹنٹ کا تقرر کیا جس کی مدد سے ریاست کا حساب کتاب انگریزی حکومت کی طرز پر ہونے لگا۔ جس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی رقم کے لیے محکمہ آڈٹ سے سٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری تھا۔ نواب رضا علی خاں نے اپنے عہد میں کئی صنعتیں اور فیکٹریاں قائم کیں رضا ٹیکسٹائل، شوگر مل، ماچس فیکٹری، چمڑا فیکٹری اور دیگر چھوٹے کارخانوں اور کاروبار کی وجہ سے رامپور ایک صنعتی شہر بن گیا تھا اور اسے چھوٹے کان پور سے تعبیر کیا جانے لگا تھا۔

ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں میں نواب رضا علی خاں سب سے پہلے حکمراں تھے جنھوں نے آزادی کے فوراً بعد اپنی ریاست کو انڈین گورنمنٹ میں ضم کیا۔ آزادی کے بعد 15 مئی 1949ء کو انھوں نے حکومت ہند کے ساتھ ریاست رامپور کے الحاق کے معاہدہ پر دستخط کئے اور یکم جون 1949ء کو اسے مرکزی حکومت کو سونپ دیا۔ یکم

دسمبر 1949ء کو مرکزی حکومت نے رامپور کو اتر پردیش کے سپرد کر دیا۔صوبائی حکومت نے رامپور کو ضلع بنا دیا اور تمام انتظام ضلع انتظامیہ کو دے کر نواب رضا علی خاں کے ذاتی اخراجات کے لئے ساڑھے چھ لاکھ روپے سالانہ اور کچھ مراعات واعزازات دیے۔ 1966ء میں نواب رضا علی خاں کا انتقال ہوا۔ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے لڑکے نواب مرتضی علی خاں کے لئے مثل سابق ساڑھے چھے لاکھ روپے اور مراعات باقی رکھی گئیں لیکن 1971ء کے دستور کی دفعہ 262/291 کے تحت یہ سہولت ختم کر دی گئی۔اس طرح دو سال تک قائم رہنے والی ریاست روہیل کھنڈ و رامپور کا خاتمہ ہو گیا۔

روہیل کھنڈ کے نوابین نے علم وادب کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ریاست کے بانی نواب علی محمد خاں سے لے کر آخری نواب رضا علی خاں تک تمام نوابین علم دوست علم پرور اور ادباء،شعراء،علماء اور فضلاء کے قدردان رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر ایک نواب کے دربار میں علماء اور ادباء کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی تھی اور ان کی بھرپور سرپرستی بھی ہوتی تھی۔

****

حوالہ جات

1۔اخبار الصنادید از مولوی نجم الغنی، مطبع نول کشور (لکھنؤ) 1918،ص 50

2۔ایضاً ص 51، 52

3۔ایضاً،ص 50

4۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی 1963،ص 42، 43

5۔ایضاً،ص 46، 47، 48

6۔ایضاً،ص54

7۔گل رحمت (تاریخ روہیل کھنڈ) ازنواب سعادت یار خان، مترجم پروفیسر شاہ عبدالسلام، رامپور رضا لائبریری2002،ص6،7

8۔ایضاً،ص11،12

9۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی1963،ص 58،59

10۔اخبار الصنا دید (جلد اول) ازمولوی نجم الغنی، مطبع نول کشور (لکھنؤ)1918،ازص149 تاص190

11۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی1963، ص108

12۔ایضاً،ازص129 تاص223

13۔گل رحمت (تاریخ روہیل کھنڈ) ازنواب سعادت یار خان، مترجم پروفیسر شاہ عبدالسلام، رامپور رضا لائبریری2002،ازص144 تاص168

14۔اخبار الصنا دید (جلد اول) ازمولوی نجم الغنی، مطبع نول کشور (لکھنؤ)1918،ازص597

15۔ایضاً،ص597

16۔ایضاً،ازص626 تاص672

17۔ایضاً،ازص673 تاص755

18۔ایضاً،جلد دوم،ازص2 تاص20

19۔ایضاً،ازص23 تاص122

20۔ایضاً،ص185

21۔کتابوں کا تاج محل ازمولانا امتیاز علی عرشی

22۔اخبار الصنا دید (جلد دوم) ازمولوی نجم الغنی، مطبع نول کشور (لکھنؤ)1918،ازص302 تا480

****

باب دوم

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقاء

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز وارتقاء

دہلی کا اجڑنا بھی عجب رہا کہ کئی علاقے علم وادب سے آباد ہو گئے رامپور، عظیم آباد اور لکھنؤ کی سرزمین پر شعرو سخن کی نشستیں سجیں اور داد وتحسین کی خوب خوب بارشیں ہونے لگیں۔ شاعری اپنا کوئی خارجی وجود نہیں رکھتی البتہ شاعر ضرور مقام خاص رکھتے ہیں لیکن یہ بھی جہاں مناسب طبع ماحول دیکھتے ہیں مقام اول سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور اپنے خون جگر سے شعر وسخن کی شمع کو جلائے رکھتے ہیں۔ روہیل کھنڈ اپنی تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے جداگانہ طرز معاشرت اور ادب میں انفرادی نوعیت کا حامل علاقہ ہے۔ یہاں اگر صوفیا نے اپنی زبان میں تبلیغ دین کے فرائض انجام دیے، واعظین نے پند ونصائح اور ارشادات سے لوگوں کو راہ راست کی تلقین کی تو وہیں ادبا وشعرا نے ادبیات کے گیسو سنوارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز کب ہوا یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن جو جھلکیاں گیتوں، کہہ مکرنیوں اور دوہوں وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں شاعری کا آغاز بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی میں ہوا ہوگا۔ محمد بن قاسم کے زمانے سے صوفیوں کی آمد تیز ہوئی اور اس خطے میں جو صوفی آئے وہ یہیں کے رنگ میں رنگ گئے جس کے نشانات رام بھکتی اور کرشن بھکتی شاعری میں مسلم شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔

گیارھویں صدی میں روہیل کھنڈ میں سید سالار مسعود غازی کی آمد اور ان کے سپاہیوں کی اقامت سے اردو کا ارتقا ہوا جس کو نظم میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بیشک اس وقت لسانی طور پر جو اختلاطی عمل رونما ہوا اس زبان کا نام ہندی رہا پھر ریختہ، اردوئے معلیٰ اور دہلوی کا سفر طے کرتے ہوئے اردو ہوا۔

محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کے بعد بارھویں صدی کے آخر میں دلی سلطنت کی بنیاد پڑی جس کی وجہ سے روہیل کھنڈ میں بھی ہزارہا مسلمان رچ بس گئے۔ روہیل کھنڈ کے ضلع بدایوں میں 1233ء میں حضرت نظام الدین

کی پیدائش اوران کے خاندان اوراس علاقے کےعوام کی اس دور کی زبان اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہاں ہندوستانی زبان میں غم وخوشی کےموقعوں پرالفاظ کونظم کرنے کے بعد گانے کا رواج رہا ہوگا جیسا کہ امیر خسرو کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ساتھ ہی سنبھل میں مدرسہ الشرع کا بھی قیام ہوا جو مقامی و بیرونی طلبہ کی تعلیم کا روہیل کھنڈ میں سب سے پہلا مرکز تھا۔امیر خسرو1253ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے ابھی کمسن تھے کہ ان کے والد جنگ میں شہید ہوگئے اورامیر خسرو اپنے نانا عمادالملک کے پاس دہلی میں رہنے لگے کچھ ہوشیار ہونے پر مدرسہ الشرع میں بھی تعلیم پائی۔حضرت نظام الدین کے مرید ہوئے اوران کے مشورے پرعوامی زبان میں ادبی تخلیقات لکھیں۔

حضرت نظام الدین کے کانوں میں کمسنی کے عالم میں جس زبان کا رس گھلا اس کی تسکین نظمیہ الفاظ کی صورت میں ہوئی جس میں امیر خسرو اوران کے پیر بھائی اور دیگر سنت بھی اپنی نگارشات پیش کرتے تھے۔عوام کی نفسیات کا مطالعہ ظاہر کرنے والے الفاظ امیر خسرو کے کلام میں زیادہ ہوتے تھےاور مشاہدے عام زندگی سے مستعار۔لہٰذا سامعین کو کلام خسرو از بر ہوتا رہا۔عوام میں اس کی پیروڈیز بھی ہوئیں اور تبدیلی کے ساتھ بھی یہ کلام رواج پاتا رہا۔ادھر سنبھل میں 1236ء میں رکن الدین سرائے کا قیام ہوااور موجودہ سنبھل سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر قلعہ فیروزی کی بنیاد رکھی گئی جسے بعد کے سلاطین نے مکمل کرایا اور آج بھی اس قلعے کے کھنڈرات فیروز پور میں موجود ہیں۔سرکار سنبھل کا پہلا مسلم صوبیدار 1245ء میں جلال الدین ہوا کٹھیریوں کی بغاوت پر ناصرالدین محمود کے زمانے میں اسے سنبھل چھوڑنا پڑا۔ فیروز شاہ سوم کے دوراقتدار میں سنبھل خفیہ دارالخلافہ کا درجہ رکھتا تھا یہ درجہ مسلم سلطنتوں کے دور میں سنبھل سرکار کے نام سے معروف ہوا۔اس کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ اس دور کے سب صوبوں سے زیادہ خراج سنبھل صوبہ مرکزی حکومت دہلی میں جمع کرتا تھا۔ بارھویں صدی کے بعد سے روہیل کھنڈ میں نقالیوں،نندنہ کھیلنے والوں، رام لیلا کرنے والوں اور سوانگ دکھانے والوں کی زبان میں تبدیلی ہوئی کیونکہ یہ تمام کھیل کھیلنے والے دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف رجھاتے تھے تاکہ شائقین میں اضافہ ہوااور زیادہ سے زیادہ انعام واکرام پاسکیں۔ان کے جملوں میں تک بندی پر مشتمل الفاظ کے ایسے مجموعے ہوتے تھے جن سے لحن پیدا ہوتا تھا اوران جملوں کو اکثر نظمیہ صورت میں پیش کرتے تھے جس پر موسیقی اور ناچ کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔عرصہ دراز تک پیروں فقیروں کے عرسوں میں انہیں کھیل تماشوں کا اہتمام ہوتا تھا لیکن آداب ضرور ملحوظ رکھے جاتے تھے۔اس کے بعد قوالی کا چلن شروع ہوا جو فارسی سے مستعار کلام پیش کرتا اور سامنے لاتا رہا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اس خطے میں مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی رہی اورعوام میں یہاں کی کلچرل شاعری کو فروغ بھی ملتا رہا۔سولھویں صدی میں ظہیرالدین بابر نے خود اس علاقہ کا دورہ کیا تھا اور سوا ماہ یعنی قریب چالیس روز

سنبھل میں قیام کیا تھا بابر کے انتقال کے بعد سنبھل ہمایوں کے حصہ میں آیا جسے ہم دیرینہ روہیل کھنڈ کہہ سکتے ہیں۔ جب بابر کا انتقال ہوا تو ہمایوں سنبھل صوبہ میں ہی موجود تھا۔

''۹۳۷ھ میں شہزادہ ہمایوں سنبھل میں مقیم تھا یکا یک بابر کے مرنے کی خبر سن کر دہلی گیا اور وہاں جا کر تخت پر بیٹھا۔'' [۱]

اس صدی تک یہاں کے معاشرتی نظام اور تہذیب وثقافت میں اردو کلچر پورے شباب پر تھا۔ اس علاقے ہی کی تعلیم نے امیر خسرو سے کہلوایا۔۔

چھاپ تلک سب چھینی رے مو سے نینا ملائے کے
نیناں ملائے کے سینا چلائے کے

جب اردو نے اٹھارہویں صدی میں قدم رکھا تو یہ زبان اچھی خاصی نکھر چکی تھی۔ شمال ہند میں اٹھارہویں صدی سے پہلے جو شاعری ہوا کرتی تھی وہ اکثر فارسی، عربی اور سنسکرت میں ہوا کرتی تھی۔ اس دور کے شعرا عوامی زبان اردو (ہندوی، ہندوستانی یا ریختہ) میں شاعری کرنا گراں سمجھتے تھے جس کی وجہ سے عوام کا ایک بڑا طبقہ شاعری کے لطف سے محروم رہ جاتا تھا۔ لیکن جیسے ہی اٹھارہویں صدی شروع ہوئی اور 1719ء میں ولی کا دیوان شمال ہند میں پہنچا تو یہاں کے شعرا نے ولی کی اتباع کرتے ہوئے اپنی شاعری کا محور ریختہ (اردو) کو بنالیا اس طرح ریختہ میں شاعری کرنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ چونکہ روہیل کھنڈ کا علاقہ شمال ہند میں آتا ہے تو یہاں بھی ریختہ میں شاعری ہونے لگی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز بارھویں یا تیرھویں صدی ہوا ہوگا لیکن سولھویں صدی کے نصف اول تک کسی بھی ایسے شاعر کا نام نظر نہیں آتا جو روہیل کھنڈ کے علاقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ البتہ امیر خسرو کا مدرستہ الشرع سنبھل میں تعلیم حاصل کرنا، حضرت نظام الدین کا بدایوں میں پیدا ہونا اور امیر خسرو یا دیگر حضرات کا اس دور میں شاعری کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں بھی اس دور سے ہی شاعری کا آغاز ہوا ہوگا۔ تذکروں اور دوسری تواریخ کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں ریختہ کے پہلے شاعر ملا نوری ہیں ان کے بعد سترھویں صدی کے نصف آخر میں اسمعیل اور اعظم اور اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں ثاقب اور سعادت وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔

نوریؔ:

نوری کا نام ملا نوری اور تخلص نوری تھا۔ نوری اعظم پور کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ معنوی وصوری فضیلتوں

کے حامل اور حقیقت شناس تھے۔علم بدیع و معنی میں یکتائے روزگار تھے۔فارسی اشعار بغیر تامل کے کہتے تھے چنانچہ طویل قصیدہ "الذیل" ان کی یادگار ہے۔

ملا نوری کا ذکر قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے مخزن نکات میں کیا ہے۔مخزن نکات تین طبقات پر مشتمل ہے۔طبقہ اول میں متقدمین، طبقہ دوم میں متوسطین اور طبقہ سوم میں متاخرین کا ذکر کیا گیا ہے۔طبقہ اول یعنی متقدمین میں ان شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جن کا انتقال قائم کی پیدائش سے کافی پہلے ہو گیا تھا۔مخزن نکات کے مقدمے میں اقتداء حسن لکھتے ہیں:

> ''طبقہ اول کے شعرا کے بارے میں البتہ مؤلف کو روایات میں دوسروں سے اخذ کی ہوئی معلومات پر انحصار کرنا پڑا'' ۲؎

متقدمین میں ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ قائم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ نوری کس دور کے شاعر تھے۔لکھتے ہیں:

> ''گویند وقتی کہ ابوالفیض فیضی مثنوی 'نل ودمن' تصنیف می کرد، چوں بہ این مصرعہ رسید:
>
> موی شد،ام زناتوانی
>
> بجہت تمامی معنی افتادہ و مضمون مصرع ثانی بخاطرش نمی رسد؛ ملای مذکور بسابقہ معرفتی کہ داشت برائے ملاقات وی رفت ؟ بوذ بحقیقت حال وارسید،مصرع بر بدیہہ گفت:
>
> مو برتن من کند گرانی
>
> فیضی بر لطف طبیعتش آفرین کرد واز ان باز اورا بسیار دوست می داشت۔'' ۳؎

یہ عبارت اس بات پر دال ہے کہ ملا نوری کے فیضی کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔تعلقات کا پایا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فیضی کے دور میں موجود تھے اور فیضی دربار اکبری کے ملک الشعرا تھے جیسا کہ محمد طیب صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اکبر کو فیضی سے دوستی ہو گئی چنانچہ وہ اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے لگا۔990ھ میں آگرہ، کالپی اور کالنجر کی صدارت فیضی کے سپرد کی گئی۔993ھ میں جب یوسف زئی کے خلاف فوج بھیجی گئی تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا۔997ھ میں وہ ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا۔'' ۴؎

جمیل جالبی نے بھی ملانوری کا شمار اکبر کے عہد کے شعرا میں ہی کیا ہے۔ وہ اردو کی نشو ونما کے حوالہ سے تاریخ ادب اردو جلد اول دوسرا باب (بابر سے شاہجہاں تک) کے عہد اکبر میں ملانوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادبی سطح پر زبان کے استعمال کی ایک صورت یہ ہے اور دوسری صورت وہ ہے جو ہمیں ملا نوری کے شعر میں ملتی ہے جس میں ایک مصرع خالص ٹکسالی فارسی زبان میں ہے اور دوسرا مصرع خالص بامحاورہ اردو میں ہے۔'' ۵

اس بحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملانوری اکبر کے عہد یعنی سولھویں صدی کے نصف آخر کے شاعر ہیں۔ مختلف تذکروں اور تاریخی کتب میں تلاش وجستجو کرنے کے بعد بھی نوری کا ایک شعر کے علاوہ اور کلام دستیاب نہیں ہو سکا حالانکہ انہوں نے ریختہ کی دو تین غزلیں کہی تھیں جن کے بارے میں قائم لکھتے ہیں:

''دو سہ غزل ریختہ بطور قدما از وی مسموع است؛ اما بالفعل سوای این یک بیت مقطع چیزی دیگر در خاطر نیست۔'' ۶

نمونہ کلام

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اسمعیل:

اسمعیل امروہہ کے رہنے والے تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ" کے آخر میں کیا ہے:

وطن امروھا مرا ھے ' شہر نام
اسی جائے پر مرا ھے گا قیام
شعر نمبر 311

اسی طرح اپنی دوسری مثنوی "قصہ معجزہ انار" کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

کہ ھے امروھا شہر ' میرا وطن
جو دلی کے نزدیک ھے ' با امن

شعر نمبر 140

اسمعیل کے مورث اعلیٰ مخدوم سید حسن عرف سید شرف الدین شاہ ولایت اپنے والد میر علی بزرگ کے ساتھ 470ھ میں واسط سے ملتان ہوتے ہوئے امروہہ آئے تھے۔ میر علی بزرگ فیروز شاہ خلجی کے عہد میں اقضی القضاہ مملکت ہند تھے۔ ابن بطوطہ جب 471ھ میں امروہہ آیا تھا تو آپ کا ہی مہماں رہا تھا۔ اسمعیل کے والد سید ابراہیم جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے آخر میں ایک جنگ کے دوران کام آئے۔ اسمعیل کے بڑے بھائی سید عالم شاہ شاہجہاں کے عہد میں یک ہزاری ذات، پانسو سوار کے عہدے پر فائز تھے۔

اسمعیل کی پیدائش امروہہ میں ہی ہوئی اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ اسمعیل نے اپنی عمر کا ایک اچھا خاصہ حصہ اپنے وطن میں ہی گزارا تھا۔ نائب حسین لکھتے ہیں:۔

> ''اسمعیل نے عمر کا خاصہ حصہ اپنے وطن میں گزارا، اس لیے کہ صاحب اولاد ہونے کے علاوہ، آپ کا شعور اور صلاحیتیں بیدار ہو چکی تھیں کہ اپنی اولاد کے رہن سہن کی فکر میں ترکہ پدری سے 'اسمعیل سرائے' کی بنیاد ڈالی'' ۷

اسمعیل کی پیدائش کب ہوئی یہ بات پردۂ خفا میں ہے کیونکہ اس حوالہ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ کس تاریخ یا سنہ میں پیدا ہوئے البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ 1052ھ یعنی 1641 / 42ء میں موجود تھے۔ جیسا کہ نائب حسین نقوی نے قیاس کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مراد آبادی دروازہ عین اس مقام پر واقع ہے جس سے اسمعیل سرائے کی سرحدیں ملتی ہیں ہوسکتا ہے کہ اسمعیل سرائے اور اس دروازے کی بنیادیں ساتھ ساتھ رکھی گئی ہوں، اس لیے کہ میراں سید عبدالماجد اور میر اسمعیل آپس میں چچازاد بھائی تھے اور دونوں نے باہمی طور پر قربت کے سبب اپنی سکونت کی جگہ تجویز کی ہو۔ تاریخ کے اس حوالے کے ماتحت میر اسمعیل کا 1052ھ میں بھی وجود ملتا ہے اور یہ شاہجہاں کا عہد تھا'' ۸

آگے چل کر نائب حسین نقوی اسمعیل کی سن ولادت کے متعلق ایک مدلل بحث کرنے کے بعد سن ولادت اور سن وفات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سن وفات 1123ھ مطابق 1711 / 12ء معلوم ہے، نیز تاریخ ولادت کا تعین 1030ھ سے 1040ھ کے درمیان کیا گیا ہے۔'' ۹

تصانیف:

اسمعیل نے دومثنویاں ایک 'وفات نامہ بی بی فاطمہ' اور دوسری 'مثنوی معجزہ انار' تصنیف کیں۔ان کے علاوہ ایک اور مثنوی 'سوت ندی' کے نام سے لکھی تھی لیکن وہ اب نایاب ہے۔سوت ندی امروہہ کے قریب ایک برساتی نالہ ہے۔سوت ندی کے متعلق نائب حسین لکھتے ہیں:

''اسمعیل کی ایک مثنوی 'سوت ندی' بھی عالم وجود میں آئی، لیکن اس کا سراغ ہم کو نہیں ملا اور نہ اس کا سن تصنیف ہی معلوم ہوسکا'' [10]

(ا) مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہ 1105ھ مطابق 1693ء میں لکھی گئی جس کا ذکر اسمعیل نے خود مثنوی کے تین سو پندرھویں شعر میں کیا ہے۔

اتھے سال ھجری نبی کے عیاں
گیارہ سو اور پانچ تھے وجہ جاں

اس مثنوی کے نسخوں کے متعلق نائب حسین نے مندرجہ ذیل خاکہ پیش کیا ہے جو ''اردو کی دو قدیم مثنویاں'' کے صفحہ نمبر 97 پر موجود ہے۔

بنیادی نسخہ (الف) :

حیدر حسین یکتا۔ محررہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء

نقل کردہ :

از مخطوطہ "کامل جاں" مصححہ مصنف در ۱۱۰۶ھ مطابق ۱۶۹۴ء

تعداد اشعار ــــــ ۳۱۹

مطابقت نسخہ "ب" :

مجلہ سہ ماہی "اردو" کراچی ۱۹۵۱ء، از مولوی عبدالحق مرحوم

مطبوعہ اشعار ــــــ ۳۱۸

شعر نمبر ۵۳ ــــــ مکرر

صحیح تعداد اشعار ــــــ ۳۱۷

اگر نسخہ "ب" کے گیارہ زائد اشعار نسخہ "الف" میں شامل کر لیے جائیں تو یہ مثنوی ۳۳۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت سے وفات تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس مثنوی کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

الٰہی! توں صاحب ہے سنسار کا
ھمن کوں ہے امید، دیدار کا

اور اختتام اس شعر کے ساتھ ہوتا ہے۔

قصہ پورا کیتا جو سن کان دھر
پڑھو کلمہ خوش ہوئے ہر وقت پر

(۲) مثنوی معجزہ انار 1120ھ مطابق 1708ء میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کی بھی سن تصنیف کا ذکر اسمعیل نے خود اس مثنوی کے آخری دوسرے شعر یعنی ایک سوسینتالیسویں شعر میں کیا ہے۔

گیارہ سو اوپر بیست سن تھے نبی
اسی روز قصہ میں کہا سبھی

اس مثنوی کے دو مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔ پہلا مخطوطہ۔ نائب حسین نقوی کو اپنے گھر کے کاغذات میں پونے تین سو سال پرانی بیاض ملی جس میں اس مثنوی کا مخطوطہ بھی موجود تھا۔

دوسرا مخطوطہ نسیم امروہوی کراچی کے کاغذات میں ملا جوان کے پردادا سید حیدر حسین یکتا کا مکتوبہ تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے:

''المتوفی 1123 ھجری النبوی' مصنف وفات نامہ بی بی فاطمہ است کہ مولانائے مبرور در 1120 ھجری انشا کرد' الآں بست وہفتم رجب المرجب 1284ھ از نسخہ کہ نوشتہ محمد الیاس خاں در 1121ھ ومال اخی سید قربان حسین است' نقل نمودہ شد'' [11]

اس مثنوی میں خیبر کے بادشاہ بلقیس شاہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ ایک مغرور اور متکبر بادشاہ تھا۔ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معجزہ کے ذریعہ قائل کیا تھا۔

اس مثنوی کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

الٰہی تو دانا ہے ہر کاج کا
سر انجام دیتا ہے محتاج کا

اوراختتام اس شعر کے ساتھ ہوا ہے۔

پڑھو کلمہ سب مل، نبی کے جو نام
ز برکت محمد علیہ السلام

اس مثنوی کے کل اشعار کی تعداد ایک سواڑتالیس ہے۔

اعظم:

اعظم کا نام شاہ محمد اعظم اور تخلص اعظم تھا۔ اعظم کا شمار قصبہ سندیلہ کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ جوانی کے عالم میں سپاہی کی نوکری اختیار کی جب جوانی ڈھلنے لگی تو روزگار ترک کر کے مرادآباد شہر میں آبسے اور تصوف کا دامن تھام لیا اور قناعتی زندگی گزارنے لگے۔ اکثر شہر کے رئیس حضرات خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار کرتے۔

اعظم کا ذکر بھی قائم نے اپنے تذکرے مخزن نکات کے طبقہ اول (متقدمین) میں ہی کیا ہے لیکن ان کا دور متعین نہیں کیا کہ یہ کس کے زمانہ میں موجود تھے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ مرادآباد میں آبسے تھے۔ جیسا کہ قائم نے لکھا ہے:

''آخر حال ترک روزگار کردہ در بلدۂ مرادآباد از کمال استقامت بہ فقر وقناعت گزرانید'' ۱۲

مرادآباد کو رستم خاں نے 1629ء میں بسایا تھا جس کا ذکر مولانا نجم الغنی نے اخبار الصنادید (جلد اول) میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''1625ء میں راجہ رام سکھ کٹھیر یہ نے شاہ جہاں کے نوکروں پر کچھ زیادتی کی اور کمایوں کے راجہ نے بھی ان لوگوں کی شکایت بادشاہ سے کی اس پر شاہ جہاں نے نواب رستم خاں دکھنی کو اس مہم پر مامور کیا رستم خاں نے حکمت عملی سے راجہ کو مار کر کٹھیر یوں پر تسلط حاصل کر کے اپنے رہنے کے واسطے ایک قلعہ اور ایک مسجد چوپالہ کی آبادی کے مقابل رام گنگا کے کنارے 1629ء مطابق 1046ھ میں تعمیر کرائی اور اس کا نام رستم آباد رکھا شاہ جہاں نے رستم خاں کو طلب کر کے راجہ رام سکھ کے مارے جانے اور اس کی خانہ ویرانی کا حال استفسار کیا اس کے بعد یہ سوال بھی ہوا کہ نئی آبادی کا نام تم نے کیا رکھا ہے۔ رستم خاں نے بادشاہ کے خوف سے اس کا نام بدل کر شہزادے مراد بخش کے نام سے مرادآباد ظاہر کیا اس بیان سے بادشاہ کا غصہ فرو ہوا اور رستم خاں کو مرادآباد کا ناظم مقرر کر کے روانہ کیا۔'' ۱۳

اب جب کہ مرادآباد کا قیام 1629ء میں عمل میں آیا تو اس کو صحیح طور سے مستحکم ہونے میں بیس تیس سال کا عرصہ تو ضرور لگا ہوگا کیونکہ رستم خاں نے 1629ء میں صرف ایک مسجد اور قلعہ ہی تعمیر کرایا تھا۔ ان دو عمارتوں کو ایک بڑی بستی کی شکل اختیار کرنے میں بیس تیس سال یا نصف صدی کا عرصہ ضرور لگا ہوگا اور اس وقت اتنے ذرائع بھی نہیں تھے کہ لوگ آسانی سے ہجرت کر سکیں۔ جب انسان ہجرت کرتا ہے تو وہ اس جگہ کرتا ہے جہاں کے حالات سازگار ہوں اور لوگ خوش حال زندگی جی رہے ہوں۔ جب مرادآباد معروف اور خوش حال بستی بنا ہوگا تبھی اعظم نے یہاں کے لوگوں کی خوش حال زندگی کی خبر سن کر سترھویں صدی کے نصف آخر کے کسی عشرہ میں ہجرت کی ہوگی۔

اعظم کو شاعری کا کچھ خاص شوق نہیں تھا بس کبھی کبھی شاعری سے شغف رکھنے والے لوگوں کی مناسبت سے ایک دو شعر ریختہ اور فارسی میں کہہ دیتے تھے۔ جیسا کہ قائم نے لکھا ہے:

''گاہی بہ مناسب مردم ایں فن یک دو بیت ریختہ وفارسی موزوں می کرد'' [۴۱]

اعظم کا بھی دو اشعار کے علاوہ اور کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

نمونہ کلام

حال حاصل ہے جسے قال ہوا یا نہ ہوا
رخ نیکو پہ خط خال ہوا یا نہ ہوا
دم قدم کا ہے فقیروں کے لیے تکیہ ہی
جھونپڑی چھتاڑ کا محال ہوا یا نہ ہوا

ثاقبؔ:

ثاقب کا نام شہاب الدین اور تخلص ثاقب تھا، قصبہ سیوہرہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ درویش صفت آدمی تھے۔ شاعر پرگو اور پرکشش گفتگو کرتے تھے۔ شاعری میں شاہ مبارک آبرو سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے لیکن بعد میں سراج الدین علی خان آرزو سے کرنے لگے تھے۔ ثاقب کو اکثر فنون میں دسترس حاصل تھی۔ اس قدر قابل ہونے کے باوجود خود کو ہیچ لوگوں میں شمار کرتے تھے۔

ثاقب آبرو اور خان آرزو کے دور کے شاعر ہیں کیوں کہ قائم نے ثاقب کا شمار مخزن نکات میں طبقہ دوم (متوسطیں) کے شعرا میں کیا ہے جب کہ میر، سودا، درد، سوز اور خود کا شمار طبقہ سوم (متاخرین) میں کیا ہے۔ طبقہ دوم میں قائم نے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جو قائم کے زمانے سے کچھ ہی عرصہ پہلے انتقال کر گئے تھے یا ان شعرا کا ذکر کیا ہے جن کا

قائم نے آخری زمانہ دیکھا تھا۔ طبقہ دوم کے شعرا کے تعلق سے اقتدا حسن مخزن نکات کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''مولف نے طبقہ دوم کے چند شاعروں کا آخری زمانہ دیکھا تھا، بعض کے ساتھ مشاعروں میں غزلیں بھی پڑھی ہونگی، اور جو بقید حیات نہیں رہے تھے انہیں بھی سفر آخرت اختیار کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اس دور کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بڑی حد تک ذاتی مشاہدے یا تحقیق کا نتیجہ ہے۔'' ۱۵

طبقات الشعرا میں قدرت اللہ شوق نے بھی ثاقب کو پہلے مقالے کے طبقہ دوم میں شامل کیا ہے (جس میں ایہام گو شعرا کا ذکر کیا گیا ہے) اور میر وسودا وغیرہ کا ذکر طبقہ سوم میں کیا ہے جو کہ شعرائے متاخرین اور بعض نو مشقان شعرا کے بارے میں ہے۔ میر حسن نے بھی "تذکرہ شعرائے اردو" میں ثاقب کو متوسطیں میں ہی شمار کیا ہے لیکن میر وسودا وغیرہ کا شمار بھی متوسطین میں ہی کیا ہے۔

ان سب اشاروں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ثاقب میر وسودا وغیرہ سے پہلے کے اور آبرو کے زمانے کے شاعر ہیں اس لحاظ سے ثاقب اٹھارہویں صدی کے نصف اول کے شاعر ہوئے۔

ثاقب کی پیدائش کب ہوئی اس حوالے سے کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ وفات کے متعلق اشارہ ضرور ملتا ہے کہ کب ہوئی۔ جنگ سکرتال 1772ء میں جب افغانوں کو مرہٹوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ نانک متہ کے جنگلات کی طرف چلے گئے جن میں ثاقب بھی شامل تھے اور وہیں پر ثاقب کا انتقال ہوا جیسا کہ شوق نے لکھا ہے:

''وقتے کہ افواج افاغنہ از دست مرہٹہ شکست خوردہ بہ طرف جنگل نانک متہ فراری شدہ بود، ودیعت حیات بہ مالک حقیقی سپرد. خداش بیامرزاد'' ۱٦

طبقات الشعرا کی تکمیل 75 / 1774 میں ہوئی یعنی تکمیل تذکرہ تک ثاقب کا انتقال ہو چکا تھا تبھی شوق نے ان کے انتقال کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثاقب کا انتقال 1772ء سے 1774ء کے درمیانی عرصہ میں کسی وقت ہوا ہوگا۔

ثاقب کا ایک ضخیم دیوان تھا جو اب نایاب ہے جیسا کہ قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے:۔

''اگر چہ دیوان ضخیم دارد، اما بہ نظر ایں راقم الحروف نیامدہ'' ۱۷

اس کے علاوہ مختلف تذکروں میں تلاش وجستجو کرنے کے بعد ثاقب کے صرف چار اشعار ہی دستیاب ہو سکے۔ جن میں سے ایک شعر ایسا ہے جس کو عموماً ہر تذکرہ نگار نے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے اور ایک شعر ایسا ہے جو صرف طبقات الشعرا میں درج ہے اور ان کے علاوہ دو شعر ایسے ہیں جو صرف تذکرہ ریختہ گویاں میں ہی نقل کیے گئے ہیں۔

ان اشعار میں پہلے شعر کے پہلے مصرع کو تذکرہ نگاروں نے مختلف طریقہ سے نقل کیا ہے۔

نکات الشعرا:

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نیں آکے پوچھا

تذکرہ شعرائے اردو، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرہ ہندی:

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نے آکے پوچھا

مخزن نکات:

ثاقب کی لاش اوپر قاتل نے آکے پوچھا

طبقات الشعرا:

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نے آپکارا

نمونہ کلام

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نے آپکارا
یہ کون مر گیا ہے، کس کا ہے یہ جنازہ

مر گئے تو بھی کچھ نہ پوچھی بات
تس پہ ثاقب کا یار کہتے ہیں

سعادتؔ:

سعادت کا نام میر سعادت علی اور تخلص سعادت تھا۔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ سلیم الطبع اور کم بولنے والے انسان تھے۔ نہایت با اخلاق انسان اور سادہ طبعیت کے مالک تھے۔ بات کرنے کا انداز درویشوں والا اور فقیری لبادہ پہنتے تھے۔ شاہ ولایت کے مریدین میں سے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ شاعری میں کافی ابہام رکھتے تھے لیکن اشعار لطف سے خالی نہیں ہوتے تھے۔

سعادت کا ذکر قائم نے مخزن نکات اور میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو کے طبقہ دوم (متوسطیں) میں کیا ہے۔ اور قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا کے مقالہ اول کے طبقہ دوم (در ذکر شاعران ایہام گو) میں کیا ہے۔ تذکرہ

گلشن بے خار میں شیفتہ نے اور تذکرہ ہندی میں مصحفی نے سعادت کو محمد شاہ کے عہد کا بتایا ہے مصحفی لکھتے ہیں:

''معاصر شعرائے ایہام گوئی محمد شاہی است'' ۱۸

شیفتہ لکھتے ہیں:

''از مردم امروہہ بہ عہد محمد شاہ بادشاہ بود'' ۱۹

محمد شاہ کا عہد حکومت 1719ء سے 1748ء تک رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعادت بھی ثاقب کی ہی طرح آبرو کے دور کے شاعر ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے سعادت کے عادات و اخلاق پر تو مختصر روشنی ڈالی ہے لیکن حالات زندگی کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا۔ اسی وجہ سے ان کے وطن کے علاوہ اور کسی بات کا پتہ نہیں چلتا کہ پیدائش، والدین اور پیشہ وغیرہ کیا تھا۔ البتہ وفات کے متعلق تذکروں میں اشارہ ضرور مل جاتا ہے۔

سعادت کی وفات 1751ء سے 1754ء کے درمیانی حصہ میں کسی وقت ہوئی کیونکہ میر نے نکات الشعراء میں ان کی موت کے حوالے سے کوئی خبر نہیں دی ہے نکات الشعرا 1751ء میں لکھا ہے یعنی قرائن سے مان سکتے ہیں کہ 1751ء تک سعادت زندہ تھے۔ لیکن اس کے بعد سے 55 / 1754 تک ان کا انتقال ہو گیا تھا کیونکہ قائم نے مخزن نکات میں لکھا ہے کہ بہت زیادہ بخار ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا خدا رحم کرے لکھتے ہیں:

''بہ آزار تپ محرقہ از جہاں رفت خدائش بیامرزد'' ۲۰

سعادت صاحب دیوان تھے اس حوالے سے کسی بھی تذکرہ میں کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا لیکن نمونہ کلام کے طور پر متعدد اشعار ضرور ملتے ہیں۔ سعادت نے ایک مثنوی "سیلی و سجنوں" بھی لکھی تھی جس میں ان دو عاشق و معشوق کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو وزیر اعظم قمر الدین کے زمانے میں دہلی میں گزرے تھے۔ ان کا نام بھی لیلی مجنوں کی طرح سیلی و سجنوں تھا۔ جس کی طرف تذکرہ شعرائے اردو اور تذکرہ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند میں اشارہ کیا گیا ہے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

''یک مثنوی سیلی و سجنوں کہ دو عاشق و معشوق گزشتہ اند و نام او نیز بہ جائے لیلی مجنوں سیلی و سجنوں گذاشتہ'' ۲۱

مرزا علی لطف لکھتے ہیں:

''مثنوی سیلی و سجنوں کہ در زمان نواب قمر الدین خاں وزیر دو عاشق و معشوق در دہلی گزشتہ اند گفتہ'' ۲۲

اس کے علاوہ سعادت نے ائمہ کرام کی شان میں کافی منقبتیں کہی تھیں۔ چنانچہ ان کی ایک منقبت "سواری ہوئی امیر المومنین" کی کافی مشہور ہوئی تھی۔

نمونہ کلام

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں
یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں

مت دکھا اس طرح کی آن مجھے
جینے دے کوئی دم تو جان مجھے
پپھیے کی طرح دارو کے شیشے
زبان حال سے کہتے ہیں پی پی

و اللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا
ہر گز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

ہوش کھو دیتی ہیں میرا اس کی انکھیاں مے پرست
بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہوجاتا ہوں مست

کس سے پوچھوں دل مرا چوری گیا زلفوں میں رات
ایک جو شانہ ہے سو تو تیل میں ڈالے ہے ہاتھ

صدق سے بوسہ طلب کرتے ہیں، گر باور نہیں
مصحف رخسار پر پیارے رکھا تو ہم سے ہاتھ

شیخ تو جاتا ہے کیوں تسبیح کا وہاں دام لے
وہ صنم کب رام ہوتا ہے خدا کا نام لے

جب سعادت کے والدین نے شادی کی پیشکش کی کیونکہ سعادت کا دل شادی کی طرف سے منحرف ہوگیا تھا تو سعادت نے فی البدیہ ایک شعر کہا۔

پان کھا منگنی میں آخر کو ڈبایا بیاہ میں
مجھ کو یوسف کے طرح بیروں میں ڈالا چاہ میں

ردو شاعری کا رواج اس خطہ میں مدت دراز سے قائم تھا لوگ فکر سخن کرتے چلے آرہے تھے جا بجا شعرا اپنی سخن آزمائی میں مشغول تھے لیکن جب اردو شاعری نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں قدم رکھا تو علاقہ روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا دامن اور زیادہ وسیع ہوگیا۔ اور اب جگہ جگہ شعرا حضرات اپنے طرز سخن میں داد سخن دینے لگے تھے اور اردو شاعری کے فروغ میں تقریباً ہر نمائندہ صاحب سخن نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جب ہم 1774ء تک علاقہ روہیل کھنڈ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں چاروں طرف ایک وسیع ترین علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں ناموران سخن نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی روش سخن میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ جن میں سے چند شخصیات نمایاں ہیں مثلاً قائم چاند پوری، لالہ خوش وقت رائے شاداب، محمد شاکر، نواب حافظ رحمت خاں، نواب عنایت خاں، نواب محبت خان محبت، نواب محمد یار خان امیر، نواب ہدایت علی خاں ضمیر، مراد علی حیرت، کبیر سنبھلی، بدھ سنگھ قلندر، اکرام اللہ محشر، فضل علی ممتاز، حافظ امیر الدین امیر، معین الدین، پہاڑی مل، سنتو کھرائے بیتاب، عشرت ہزل، شیخ ظہور اللہ نوا، محمدی شیدا، پروانہ علی شاہ، نعیم اللہ خان نعیم، عظیم، عشقی مراد آبادی اور خواجہ حسن وغیرہ۔ یہ شعرا یکجا مشق سخن میں مشغول نہ تھے بلکہ ان میں سے کچھ شعرا ایسے تھے جو ریاست روہیل کھنڈ کے مرکزی مقام یعنی آنولہ میں شاعری کر رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو اپنے اپنے مقام یعنی علاقہ روہیل کھنڈ کی حدود کے دوسرے علاقوں میں شاعری کر رہے تھے۔ ذکر کیے گئے شعرا میں ہر درجے کے شعرا شامل رہے کچھ نے دیگر شعرا کی سر پرستی کی تو کچھ اس فن لطیف میں ایسے ماہر زمانہ ٹھہرے کہ آگے چل کر اساتذہ کہلائے۔ تو اب ضروری ہے کہ ان شعرا میں کچھ قابل ذکر شعرا کا مختصر حال اور نمونہ کلام پیش کر دیا جائے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ اس وقت کی شاعری کا موضوع سخن اور طرز سخن کیسا تھا۔

شاکر:

شاکر کا نام محمد شاکر اور تخلص شاکر تھا قصبہ اعظم پور کے رہنے والے اور درویش صفت انسان تھے۔ شاکر کا

مزاج آبرو اور ناجی کی طرح تھا۔ محمد علی حشمت کے دوستوں میں سے تھے قربت وطن ہونے کی بنا پر قائم سے بھی میل جول تھا۔ شاکر کو علم نجوم میں بصارت تامہ حاصل تھی۔ ایک ضخیم دیوان بھی تھا جو کہ اب نایاب ہے۔ شوق لکھتے ہیں:

''دیوان ضخیم دارد مگر اشعارش بسمع فقیر نرسیدہ۔'' ۲۳

نمونہ کلام

کیا پوچھے ہے حال بلبلوں کا
جو ان پہ گزرتی ہے گزر لے
گلچیں تجھ سے کیا، تری بلا سے
گل توڑ کے تیں تو گود بھر لے

معیّن:

میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں معین کا ذکر اس انداز سے شروع کیا ہے:

''شہرستان معانی و باغستان سخن دانی طبیعش بہ غایت متیں، نظمش نہایت مبیں'' ۲۴

معین کا نام شیخ معین الدین اور تخلص معین تھا اور بدایوں کے رہنے والے تھے۔ کلام کرنے کا انداز شاعرانہ تھا۔ طبیعت میں دقت پسندی تھی ہر کسی پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ اکثر معاصرین کے ساتھ کش مکش رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میر حسن کے شعر پر بے جا اعتراض کیا میر حسن نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن نہیں مانے آخر سند کے طور پر مرزا سودا کی تحریر کا حوالہ دیا لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور بولے کہ مرزا کا دیوان میں نے صحیح کیا ہے اس میں اس طرح نہیں ہے جیسا آپ دکھا رہے ہیں۔

معین نے اپنے استاد کے دیوان کو اپنی طبیعت کے موافق درست کیا اور اپنے سخن کو صحیح ٹھہرایا کیونکہ معین خود کو بدایوں کی سرزمین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حق پر سمجھتے تھے۔

معین کی اس خود پسندی کے باوجود معین کی طرح صاحب طبع پیدا نہیں ہوا۔ میر حسن لکھتے ہیں:

''لیکن باوجود ایں ہمہ خود آرای و خود پسندی مثل او ہم صاحب طبع پیدا نیست'' ۲۵

معین کو مثنوی، قصیدہ اور ہجو میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی ایک ہجو "ہجو کشمیر" اور ایک قصیدہ "قصیدہ در مقدمہ آب برو" جو کہ ہندی ڈوہا میں کہا گیا ہے بہت آب و تاب کے ساتھ کہا ہے۔

نمونہ کلام:

دیں جگہ تیری جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بت بے باک میں ہم
لخت دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصد اشک
پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈال میں ہم
خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں برنگ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

حیرتؔ:

حیرت کا نام مراد علی اور تخلص حیرت تھا۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ حیرت درویش صفت آدمی تھے، آزاد مزاج اور سنجیدہ گفتگو کرتے تھے۔ کچھ دن آنولہ میں قیام کیا تھا۔ آنولہ سے فرخ آباد جاتے ہوئے راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا جس میں حیرت کی شہادت ہوگئی۔ حیرت کی شہادت 1772ء میں ہوئی جیسا کہ شوق نے لکھا ہے:

"چند سال است کہ بہ حسب اتفاق بہ طریق سیر بہ سمت فرخ آباد روانہ شدہ بود، ناگاہ در راہ از دست قطاع الطریق متصل قصبہ مئو بہ درجہ شہادت رسید" ۲۶

طبقات الشعرا 1774ء میں لکھا گیا اور مصحفی نے حیرت کو آنولہ میں دیکھا تھا۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"فقیر او را در آوان آبادی کٹھیر روزے در آنولہ دیدہ بود" ۲۷

اور مصحفی آنولہ 1772ء میں گئے تھے یعنی حیرت تب تک زندہ تھے۔ اب جب کہ 1774 میں شوق حیرت کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے چند سال کا ذکر کر رہے ہیں تو حیرت کی شہادت 1773ء میں ممکن نہیں کیونکہ 73 اور 74 میں صرف ایک سال کا فرق ہے اور ایک سال کو چند سال نہیں کہا جا سکتا تو ظاہر ہے 1772ء میں مصحفی نے انہیں آنولہ میں دیکھا اور 1772ء میں ہی آنولہ سے فرخ آباد جاتے ہوئی حیرت کی شہادت ہوئی۔

حیرت کو شعر و شاعری کے ساتھ کافی دلچسپی تھی خواجہ میر درد سے مشورہ سخن کیا تھا اور پروانہ علی شاہ جیسے استاد شاعر کے اساتذہ میں سے تھے۔ حیرت کم کہتے تھے لیکن ان کے سخن کا مزاج اساتذہ وقت کے مزاج سے کم نہیں تھا اسی وجہ سے حیرت فن شعر میں شہرت یافتہ تھے۔

نمونہ کلام:

سمجھ کے دکھا تو بیجا ہے سب گلہ دل کا
کہ چشم تر نے ڈبویا معاملہ دل کا
یہ اشک و آہ ہے شور جنوں ہے وحشت ہے
عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا
کہاں ہے شیشہ نے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں چھلکتا ہے آبلہ دل کا

کیا قافلے یاروں کے آگے کہیں ٹھرے ہیں
آواز جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

بیتاب:

بیتاب کا نام سنتو کھرائے اور تخلص بیتاب تھا۔قوم کے کھتری اور شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں چاند پور میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ بیتاب کو تنہائی پسند تھی اکثر زندگی گوشہ نشینی اور فاقہ کشی میں گزاری اسی وجہ سے ان کے جسم پر صرف ہڈیاں ہی نظر آتی تھیں۔ بیتاب قائم کے دوستوں میں سے تھے۔جس وقت قائم اپنا تذکرہ مخزن نکات لکھ رہے تو بیتاب کی شاعری اس وقت اپنی پختگی کو نہیں پہنچی تھی بلکہ ارتقائی دور چل رہا تھا۔قائم لکھتے ہیں:

"رنگ سخن وربط کلام نیکو فہمد ،شعرش روز بہ روز ترقی است" ۲۸

لیکن جس وقت شوق نے طبقات الشعرا لکھا تو بیتاب کی مشق سخن پختہ ہو چکی تھی اور ساتھ ہی عمدہ مضامین بھی باندھنے لگے تھے یہاں تک کہ ایک مختصر دیوان بھی مکمل ہو چکا تھا۔جیسا کہ شوق نے اشارہ کیا ہے:

"دیوان مختصر ریختہ ترتیب دادہ" ۲۹

نمونہ کلام

غافل نہیں اعتبار پل کا
کیوں فکر عبث کرے ہے کل کا
بل بے تری زلف کا اکڑنا
کیا زعم ہے اس کو اپنے بل کا

بیتاب بھی کیا جوان تھا ہائے
ہو خانہ خراب اس اجل کا

محشرؔ:

اکرام اللہ محشر بدایوں کے رہنے والے تھے۔محشر ایک سعادت مند اور خوبصورت انسان تھے اور ساتھ ہی پاکیزہ سیرت کے بھی مالک تھے جس کے ساتھ ایک بار تعلق قائم کر لیتے تو پھر کبھی منقطع نہیں کرتے۔محشر کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا ہمیشہ علم کی طلب میں جد و جہد کرتے۔آزاد اور بیگانگی کے ساتھ زندگی گزارنا پسند تھا۔محشر فارسی کے زبردست شاعر تھے اکثر ان کی مثنویاں دلچسپ اور رنگین ہیں۔فارسی کا ایک مختصر دیوان اور ایک تذکرہ اولیائے بدایوں کے بارے میں ہے جو روضہ صفا کے نام سے موسوم ہے ان کی تصانیف میں سے ہیں۔جیسا کہ شوق نے لکھا ہے:

"دیوان مختصر فارسی و تذکرہ اولیائے بدایونی مسمی بہ روضہ صفا از تصانیفات اوست" [۳۰]

نمونہ کلام

عاجز ہوں دل کے ہاتھ سے ویسا ہی بعد مرگ
آرام بھی نہ لینے دیا ٹک مزار میں
اے ہمرہاں نہ کیجیو تم اب فکر زاد راہ
ہیں لخت دل بھرے مرے جیب و کنار میں
خالی ادا سے خط کی سیاہی تری نہیں
گویا چھپا ہے لشکر ناز اس غبار میں

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان جس ابتری اور بدامنی کا شکار رہا اس سے تاریخ دان واقف ہیں۔اس بدامنی کے زمانے میں کٹھیر کے علاقے میں افغانوں نے ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلائی۔ابتدا میں اس کا صدر مقام آنولہ تھا،نواب علی محمد خاں اور مکرم الدولہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ نے اپنے مختصر دور حکومت میں روہیل کھنڈ کو استحکام بخشا اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ ادبی فتوحات کا بھی ماحول پیدا کیا۔بعض متعصب مورخین نے روہیلوں کو جاہل اور غاصب لکھا ہے جو سراسر خلاف حقیقت ہے،روہیلہ خود بھی ادیب شاعر تھے اور شعرا نواز بھی۔انہوں نے اپنے مختصر دور حکومت میں خاصہ سرمایہ شاعری چھوڑا اور بہت سے شاعروں کی سرپرستی بھی کی۔جب ان کی ادبی خدمات پر نظر جاتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس مختصر دور حکومت میں ان کی

خدمات ادب کتنی زیادہ تھیں۔ اگر 1774ء میں نواب شجاع الدولہ اور ہسٹنگز نے ان کا استیصال نہ کیا ہوتا تو آج اردو شاعری کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتی۔ روہیل کھنڈ کے پٹھانوں ہی پر منحصر نہیں ہے اس وقت قوم افاغنہ کے تمام نو وارد افراد نے ملکی اقتدار حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقوں میں شعروشاعری کی محفلیں سجائیں۔ مثلاً فرخ آباد میں نوابین بنگش اردو شاعری کے بڑے قدر دان تھے۔ نواب احمد خان بنگش غالب جنگ کے دیوان اور قوم افاغنہ کے ایک فرد نواب مہربان خان رند خود اچھے شاعر اور شاعروں کے مربی تھے، مرزا سودا اور میر سوز ان کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے۔ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں بھی سخن پرور امیر تھے۔ حالانکہ ان کا زیادہ وقت میدان کارزار میں گذرا مگر انہوں نے شعرا کی قدر دانی میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ فدوی لاہوری کچھ دن ان کی ہی رفاقت میں رہے تھے اور ان کی فرمائش پر یوسف زلیخا کو اردو میں نظم کیا تھا جو نا تمام رہی تھی۔ حاتم کو بھی نواب ضابطہ خاں سے تقرب حاصل تھا ایک شعر میں نواب صاحب کی تعریف بھی کی ہے۔

حاتم اس دور کے امیروں میں
حاتم اس وقت ضابطہ خاں ہے

روہیل کھنڈ پٹھانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا ان کے قبضے میں وسیع علاقہ تھا وہ شمالی ہند کی بساط سیاست پر اہم مہرہ تھے۔ جب دہلی میں نادر گردی سے شعرا ترک وطن پر مجبور ہوئے اور فکر معاش اور سخن پرور رئیسوں کی تلاش میں نکلے تو ان میں سے دو چار شاعر بریلی و آنولہ بھی آئے کیوں کہ ان دونوں مقامات پر نواب علی محمد خاں و نواب حافظ رحمت خاں کے لڑکے شعروشاعری کی محفلیں جمائے ہوئے تھے۔ بریلی اور آنولہ میں نو وارد شعرا کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ سب شاعر صرف دہلی ہی کے نہ تھے بلکہ موجودہ روہیل کھنڈ کے مختلف اضلاع کے بھی تھے۔ روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد ہی نواب آصف الدولہ کے عہد میں دبستان لکھنؤ کی ابتدا ہوئی اور وہاں شعروشاعری کا بازار گرم ہوا جس کی اہمیت سے اردو کا ہر طالب علم واقف ہے۔ روہیل کھنڈ کے شاعروں کی 1774ء تک کی فہرست کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم روہیل کھنڈ کی اردو شاعری کی تاریخ اکثر سخن پرور امیروں کی تاریخ ہے۔

نواب حافظ رحمت خاں:

حافظ رحمت خاں پشتو، فارسی، عربی اور اردو میں دستگاہ رکھتے تھے۔ صاحب علم اور علم پرور تھے۔ نواب علی محمد خان کے انتقال 1749ء کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تدبیر سیاست میں گزرا۔ اس مشغولیت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ شاعروں کا اجتماع کرتے مگر ان کی علم دوستی اور معارف پروری کے پیش نظر قیاس ہو

تا ہے کہ انھوں نے شاعروں کی سرپستی ضرور کی ہوگی جس کا تذکرہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ الطات علی صاحب نے ان کی ادبی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''حافظ الملک پشتو و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے وہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ صاحب دیوان شاعر تھے'' ۳۱

انھوں نے حافظ الملک کے صاحب ذوق اور علم پرور ہونے کے متعلق اسٹریچی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''نواب حافظ رحمت کے پاس ایک بڑا ذخیرہ کتب تھا جس کو ان کی شکست وشہادت کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ لے گئے اور جو بعد میں شاہان اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت بنا'' ۳۲

نواب حافظ رحمت خاں کی علم دوستی ان کے صاحبزادوں کے حصے میں بھی آئی چنانچہ نواب عنایت خاں، نواب محبت خاں محبت، نواب اللہ یار خاں اور نواب مستجاب خاں سب علم دوست تھے۔ نواب عنایت خاں اور نواب محبت خاں محبت خاص طور سے شعرا کے سرپرست تھے اور مربی سخن کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

نواب عنایت خاں:

جنگ پانی پت 1761ء کے آزمودہ اور شہرت یافتہ سپاہی تھے۔ ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا البتہ وہ مربی سخن ضرور تھے۔ میر حسن نے میر عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ نواب عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔

''بہ عنایت یزدانی از راہ قدر شناسی ونکتہ دانی خان عالی شان خلف حافظ رحمت خاں، عنایت خان سہ صدر روپیہ می دارد۔ چندے در بریلی اقامت داشت۔'' ۳۳

یہ وہی مدعا شاہجہاں آبادی ہیں جنہوں نے نواب محبت خان محبت کی شادی کے موقع پر اپنا مشہور قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

پھر ہے دل شدگاں درپے آزار فلک
متصل چھڑکے ہے ناسور پہ چھاتی کے نمک

تذکرہ نگاروں نے اس قصیدہ کی بہت تعریف کی ہے، میر حسن نے لکھا ہے۔

''الحق کہ خوب گفتہ است'' ۳۴

نواب محبت خان محبتؔ:

روہیل کھنڈ کے نامور شاعر اور نہایت ذکی اور طباع تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور پشتو میں کافی کلام چھوڑا ہے۔ اُن کی ایک مثنوی اسرار محبت بہت مشہور ہے انہوں نے ایک فارسی آمد نامہ بھی لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔ محبت خان شاعری کے علاوہ موسقی کے بھی سر پرست تھے اور ان کی سرکار سے موسیقاروں کے بھی مالی مدد کی جاتی تھی۔

نواب محبت خان شاعر کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں ان کے زمانے میں اُردو ترقی کے راستے پر گامزن تھی۔ نہ صرف الفاظ کی تراش خراش کا عمل جاری تھا بلکہ خیالات، مضمون اور طرز ادا میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت انہوں نے سادہ، بے عیب اور دل پذیر اردو میں پر اثر غزلیں لکھیں۔ ان کا مفصل ذکر تیسرے باب میں کیا گیا ہے۔

نمونہ کلام

کسے خیال ہے ساقی شراب پینے کا
یہ عمر کٹ گئی خون جگر کے پینے سے

آرام ایک دم کسی پہلو نہیں مجھے
یا رب یہ کس کے درد سے بے قرار ہوں

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا
دیدہ بے اختیار بہہ آیا

محفل سخن ٹانڈہ:

بانی ریاست روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں کا جب 1749ء میں انتقال ہوا تو ریاست کی باگ دوڑ حافظ رحمت خاں نے سنبھالی۔ جب احمد شاہ درانی نے 1752ء میں پنجاب پر دوبارہ حملہ کیا تو نواب محمد علی خان کے بیٹوں کو روہیل کھنڈ جانے کی اجازت دے دی۔ فیض اللہ خان اور عبداللہ خان کے واپس آنے کے بعد ریاست روہیل کھنڈ 1754ء میں تقسیم ہوگئی۔

نواب محمد یار خان ٹانڈہ میں رہے اور ایک چھوٹا سا دربار قائم کیا۔ وہ خود عمدہ شاعر اور شاعروں کے دل سے قدردان تھے۔ اسی طرح تان سین کے خاندان کے کئی ماہرین موسیقی سے انہوں نے اس فن میں دستگاہ حاصل کی اور ستار

بجانے میں کمال حاصل کیا اور ساتھ ہی انہوں نے ان دونوں فنون کے ماہرین کی سر پرستی بھی کی۔اس وقت قائم چاند پوری بسولی میں نواب دوندے خان کی سرکار میں ملازم تھے۔میر سوز اور مرزا سودا فرخ آباد میں نواب مہربان خان رند کی محفل سخن سے منسلک تھے۔نواب محمد یار خان نے میر سوز اور سودا کو ٹانڈہ آنے کی دعوت دی لیکن وہ نہیں آسکے۔اس کے بعد انہوں نے قائم چاند پوری کو بلایا اور وہ بسولی سے ٹانڈہ چلے آئے۔نواب صاحب نے قائم سے تلمذ حاصل کیا اور سو روپئے ماہوار تنخواہ مقرر کی جیسا کہ مصحفی نے لکھا ہے:

''آخر کار میاں محمد قایم کہ درآں ایام بسولی بودند حسب الاشارہ آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت دبدر ماہہ صدروپیہ غرور امتیازش دادہ باستادیش برداشت'' ۳۵؎

ان کے علاوہ ان کے دربار میں حکیم کبیر علی سنبھلی، مصحفی، فدوی لاہوری، پروانہ علی شاہ مراد آبادی، عشرت ہزال، عزیز خان بیجان اور محمد نعیم وغیرہ جمع ہو گئے تھے۔قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ آخر میں میر سوز بھی فرخ آباد سے ٹانڈہ آگئے تھے اور خود شوق نے بھی ٹانڈہ جانے کا ذکر کیا ہے۔

نواب صاحب نے ان حضرات کی خوب قدر و منزلت کی۔قائم اور مصحفی جب ٹانڈہ آئے تو اس محفل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی لیکن نواب ضابطہ خاں والی نجیب آباد کے ساتھ 1772ء میں شریک جنگ ہونے اور شکست کے نتیجے میں یہ محفل برہم ہوگئی۔اور بعد میں جو شعرا رہ گئے تھے 1774ء میں نواب شجاع الدولہ اور انگریزی افواج کے مقابلے میں روہیلوں کی شکست اور روہیل کھنڈ پر اودھ کا قبضہ ہو جانے کی بنا پر نواب موصوف ان کو لیکر رامپور چلے گئے۔پھر سے محفل شعر و سخن گرم ہوئی لیکن نواب صاحب بیمار ہوئے اور چند ماہ کے بعد جنوری 1775ء میں انتقال ہوگیا۔لیکن محفل شعر و سخن کی جو شمع یہاں روشن ہوئی اسے یہاں کے ابتدائی معماران ادب نے بجھنے نہ دیا بلکہ پوری کوشش کر کے اسے ہر ممکن ترقی سے ہمکنار کیا۔

ابھی تک انفرادی شعر گوئی کا دور جاری تھا اور رفقائے ادب اپنے اپنے طور پر مشق سخن کر رہے تھے۔لہٰذا یاد رہے کہ علاقہ روہیل کھنڈ میں شاعری کی یہ پہلی بزم تھی جو منعقد ہونا شروع ہوئی۔اس سے پہلے یہاں کی شاعری اپنے ڈھنگ اور اپنی الگ طرز پر بکھری بکھری رہتی تھی اس کا کوئی سر پرست نہیں تھا جو اس کی پرورش کرتا اور اسے کسی باگ ڈور کے سہارے منظّم طور پر آگے لیکر چلتا۔اسی وجہ سے یعنی کسی نپی تُلی روش یا یوں کہیں کہ شاعری کا با قاعدہ نظام نہ ہونے کے سبب ہی علاقہ روہیل کھنڈ کے اکثر شعراء دہلی کا رخ کیا کرتے تھے۔کیونکہ دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہاں سخن گوئی بھی بلند پایہ کی تھی نیز دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے وہاں کے معاشی حالات بھی دیگر مقامات کے

مقابلے بہتر اور قدرے خوش گوار تھے اس کے ساتھ ساتھ وہاں سلسلہ شاعری اور محفلوں کا سجنا، ان میں شعرائے دہلی و اطراف کا جمع ہونا، اور گونا گوں خوبیوں پر مشتمل اشعار کا منظر عام پر آنا، عوام کے زبان زد ہونا اور گلیاروں میں سخن فہمی کا عام چلن بھی کافی پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ دراصل وہاں اساتذہ کافی تعداد میں موجود تھے اس لیے دہلی کے اطراف کے شعرا وہاں پہنچتے اور اپنے پسندیدہ رنگ سخن کے استاذ کے حلقہ میں شامل ہو جاتے۔ اس طرح فروغ سخن کے وہاں کئی اسباب نظر آتے تھے اسی وجہ سے دہلی میں ہمیشہ شعروشاعری کا بازار گرم رہتا تھا جس سے دہلی اور اطراف دہلی کے شعرا مستفید ہوتے تھے۔

لیکن جب یہ محفل شعروسخن یہاں سجی جس کا اوپر ذکر گزرا اور یہاں اساتذہ سخن جمع ہوئے تو علاقہ روہیل کھنڈ کے چہار جانب بسنے والے شعرا حضرات یا وہ حضرات جو ابھی نومشق تھے انھوں نے کچھ حد تک دہلی کا رخ نہ کر کے آنولہ کا رخ کیا۔ اور جب یہ محفل برہم ہوئی تو رامپور کا رخ کیا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ ٹانڈہ کی اس محفل سخن سے منسلک یا ریاست سے منسلک چند ایسے شعرا جو اس علاقے میں اساتذہ فکروفن کی حیثیت رکھتے تھے ان کا یہاں مختصر ذکر پیش کیا جاتا ہے۔

کبیر سنبھلی:

حکیم کبیر کا نام کبیر علی اور تخلص کبیر تھا۔ کبیر سنبھل کے رہنے والے تھے۔ شوق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حکیم محمد کبیر سنبھلی انصاری از اقربائے نواب امین الدولہ، جوان قابل، خوش اخلاق، در مروت وقبیلہ پروری وآشنا پرستی طاق، یار صادق، حکیم حاذق، از مدتے در رفاقت محمد یار خان امیر۔۔۔ بودہ ذہن مستقیم وطبع سلیم دارد۔ دیوان مختصر ریختہ ترتیب دادہ۔'' ۳۶

کبیر نے علم طب میں حکیم علوی خاں سے تلمذ حاصل کیا اور نواب محمد یار خان کے دربار سے منسلک ہو گئے اور ان کے خاص معالج بنے۔ جب نواب محمد یار خان کو شاعری کا شوق پیدا ہوا تو کبیر کے مشورے پر ہی نواب صاحب نے قائم چاند پوری کو ٹانڈہ طلب کیا اور پھر یہیں سے محفل سخن ٹانڈہ کی شروعات ہوئی۔ جب یہ محفل برہم ہوئی تو نواب محمد یار خان کے ساتھ کبیر بھی رامپور چلے گئے اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد کبیر نواب فیض اللہ خاں کے معالج خاص کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ آخری عمر میں سنبھل چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ جیسا کہ احمد علی شوق نے لکھا ہے:

> ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ۳۷

نمونہ کلام

کردیا بے پروبالی نے پشیماں مجھ کو
اس رہائی سے وہی خوب تھا زنداں مجھ کو

بن پان چبائے ہوئے بن لال رہے ہیں
ہیں ہونٹ ترے یا کوئی مرجان کے ٹکڑے

مناقشہ ہے عبث شیخ و برہمن میں کبیر
کسی کے کعبہ، کسی کے ہوا کنشت نصیب

پروانہ علی شاہ مرادآبادی:

پروانہ مراداباد کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں مراد علی حیرت سے تلمذ حاصل کیا بعد میں قائم کے شاگرد ہو گئے۔ قائم کے توسل سے محفل سخن میں شامل ہوئے۔ پروانہ کے متعلق شوق لکھتے ہیں:

''پروانہ علی مرادآبادی، متخلص بہ پروانہ مردے ست دیوانہ، جوائے ست مردانہ، مزاج آزادانہ، مشرب رندانہ، زہنش مناسب وموزوں شاعرانہ، شعررا بآواز بلندمی خواند، شاگرد مراد علی حیرت، حالا از محمد قائم مرقوم اصلاح می گرفت، دریں ایام جوش جنوں برخاطرش طاری ست'' ۳۸؎

پروانہ آزاد منش اور رند مشرب تھے اور شوق کے بقول دیوانگی کا بھی اثر دکھائی دیتا تھا۔ عام رواج کے برخلاف وہ بلند آواز میں شعر پڑھا کرتے تھے۔ قاسم نے مجموعہ نغز میں لکھا ہے کہ وہ نشے کے بھی عادی تھے۔ آخر میں دنیاداری ترک کر کے درویشی اختیار کر لی تھی جیسا کہ گلشن ہند میں لکھا گیا ہے۔

''دریں زمانہ عہد عالم شاہ است شنیدہ شد ترک دنیاداری کردہ لباس فقیر پوشیدہ۔'' ۳۹؎

نمونہ کلام

آج ثابت نہ رہے دل نہ کوئی جان درست
اس کے پیکاں نے کیے پھر پر و پیکاں درست
ہمت حضرت قائم سے اگر ہو امداد

چند ایام میں کہہ لیجئے دیوان درست

کیوں میاں پروانہ ہوئے جل کے ڈھیر
پھر بھی کسی شعلے کو اب چاہئے

کیوں کہ پیغام مجھے اس کا زبانی آوے
نام سنتے ہی مرا جس کو گرانی آوے
جھوٹ کہتا ہے تو قصد یہ زبانی پیغام
مجھ کو باور نہیں جب تک کہ نشانی آوے

الفت جو کی ہے تم نے تو میاں اس کہ ساتھ دو
یہ دل جو لے گئے ہو مرا میرے ہاتھ دو

اپنا تو دل زمانہ سے اب اتنا تنگ ہے
جو دم ہے زندگی کا سو شیشہ پہ سنگ ہے

مصحفی:

مصحفی کا نام غلام ہمدانی اور تخلص مصحفی تھا۔ مصحفی کی پیدائش اکبر پور پٹی میں اور پرورش امروہہ میں ہوئی۔ مصحفی کے آبا وَاجداد اکبر پور پٹی کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے۔ مصحفی کی تاریخ پیداش میں اختلاف ہے لیکن بقول نور الحسن نقوی مصحفی کی پیدائش 1747ء سے 1750ء کے درمیانہ حصہ میں ہوئی۔ مصحفی نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ امروہہ میں گزارا اور یہیں ایک مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی شاعری کی طرف رجحان تھا اس لیے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ جب فکر معاش لاحق ہوئی تو امروہہ سے نکل کر دہلی پہنچے لیکن دہلی کے حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے وہ روہیل کھنڈ یعنی آنولہ آ گئے اور قائم کے توسل سے نواب محمد یار خان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ لیکن 1772ء میں جنگ سکرتال میں نواب ضابطہ خاں والی نجیب آباد کو شکست ہوئی اور مرہٹہ گردی کے نتیجہ میں

ٹانڈہ کی یہ محفل بھی برہم ہوگئی جس کی وجہ سے مصحفی کو بھی لکھنؤ جانا پڑا۔لیکن سال بھر بھی نہیں رہ پائے تھے کہ طبیعت اچاٹ ہوگئی اور پھر سے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں تقریباً بارہ سال رہے اور فارسی نظم ونثر اور عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔تمام علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دوبارہ لکھنؤ آ گئے۔لکھنؤ آنے کے بعد وہ چند روز لالہ کانجی مل سکسینہ، محمد نعیم خان اور مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈھو سرسبز کی رفاقت میں رہے۔سرسبز کے ساتھ دو چار سال تک رہے اس کے بعد وہ شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں انشاء کے ذریعہ داخل ہوئے۔انشاء سے معرکہ آرائی کے سبب شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق منقطع ہو گیا کیونکہ انشاء شہزادہ کے استاد تھے جس کی وجہ سے شہزادہ مصحفی سے ناراض ہو گیا تھا۔دربار سے تعلق منقطع ہونے کے بعد مصحفی کی زندگی سازگار نہیں رہی۔نہ تو کسی سے توسل تھا اور نہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی۔کچھ تو شاگرد مدد کر دیا کرتے تھے اور کچھ اشعار فروخت کرنے سے آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔جس طرح بھی ہو بس اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''سنہ عمر تا الی الیوم قریب بہشتا درسیدہ باشد اکنوں دل از دنیا برکندہ جز یاد الٰہی ومصروف بودن
بہ نماز وروزہ چیزے دیگر نمی خواہد سبحانہ عاقبت بخیر کناد'' [۴۰]

آخر اسی عالم میں 1824ء لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف:

عقد ثریا 1775ء

تذکرہ ہندی 1794–95ء

ریاض الفصحا 1821ء

8 دیوان

85 قصائد

20 مثنویاں

نمونہ کلام

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم

کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہرے گا
شاہد رہیو کہ اے شب ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
یار کا صبح پر ہے وعدہ وصل
ایک شب اور بھی جیسے ہی بنی
لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے
کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آئے
اور جھپکی تو وہی خواب پریشاں آئے

فدوی لاہوری:

فدوی کا نام فیض اللہ بیگ اور تخلص فدوی تھا۔فدوی پنجاب کے رہنے والے تھے۔وہ ایک بقال کے بیٹے تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔صابر علی شاہ صابر کے شاگرد تھے۔شاہجہاں آباد سے فرخ آباد پہنچے وہاں سودا کو نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن بات بن نہیں پائی تو آنولہ آ گئے اور دربار سے منسلک ہو گئے لیکن ان کی حرکات کی وجہ سے نواب صاحب ان سے ناراض ہو گئے اور ان کو دربار سے نکال دیا۔آخر جنگ سکرتال کے تین سال بعد تپ ولرزہ میں مبتلا ہو کر ۱۱۸۸ھ میں بریلی میں فوت ہو گئے جیسا کہ شوق نے لکھا ہے:

''قریب دو ماہ شد کہ از بیماری تب ولرزہ در بریلی فوت شد'' [۴۱]

جب فدوی نواب ضابطہ خاں کی سرکار سے منسلک تھے تو انہوں نے ان کی فرمائش پر ایک مثنوی یوسف زلیخا لکھی تھی جس پر فدوی کو کافی ناز تھا اور وہ اسے ہمیشہ لوگوں کو سنایا کرتے تھے اور اسے پسند کرنے والے اس سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

فدوی بھرپور شعری صلاحیت کے حامل تھے۔ان کے یہاں جوش،اثر اور قدرت نظم کے ساتھ ساتھ ایک تیکھا پن پایا جاتا تھا۔فدوی جب مرض الموت میں مبتلا تھے تو انہیں چند اعزہ دیکھنے آئے۔فدوی نے سب کو متوجہ کرتے ہوئے بلا تکلف حسب ذیل مطلع سنایا۔شوق لکھتے ہیں:

''بعضے اعزاء در مرض الموت برائے ملاقات او رفتہ بودند،بمجرد ملاقات گفت کہ یاراں بشنوید

دریں روز ہا چہ مطلع تازہ موزوں کردہ ام‘‘ ۴۲؎

پہلو میں اپنے درد اٹھا دل کے متصل
بیٹھا رقیب ساتھ جو وہ مل کے متصل

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو شاعری سے کتنا شغف تھا کہ مرض الموت میں بھی بے خوفی کے ساتھ شعر گوئی میں مشغول تھے۔

نمونہ کلام

گلشن میں جب لٹک کے شہ گل رخاں چلے
اس کے جلو میں سر و سا رعنا جواں چلے
عمر عزیز دم لے کہ دنیا سے ایک دن
رخصت سفر کو باندھ کے سارا جہاں چلے

ہے نظر بازوں کی اے مشفق نظر چاروں طرف
دیکھتے ہیں پیش و پس ایدھر ادھر چاروں طرف
کعبہ و بتخانہ و دیر مغاں و مدرسہ
جس جگہ بھی دیکھو ہے فدوی کا گھر چاروں طرف

آوارہ و سر گشتہ نہ دیوار نہ در کے
سائے کی طرح ہم نہ ادھر کے نہ اُدھر کے
افسوس بھٹکتے ہی پھرے ہم تو جہاں میں
پوچھا نہ کسی نے کہ میاں تم ہو کدھر کے

پہنچ اے باد سحر، دوڑ اے پیک سحر
کون لاتا ہے بھلا دل کی خبر دیکھیں تو

لوگ کہتے ہیں بڑا کاٹ ہے اس تیغ کا پر
تب یقین آوے مری جان اگر دیکھیں تو

میرسوز:

سوز کا نام سید محمد میر اور تخلص سوز تھا پہلے میر تخلص کرتے تھے لیکن میر تقی میر اس تخلص کے ساتھ مشہور ہوئے تو سوز نے اپنا تخلص میر سے بدل کر سوز کر لیا۔سوز دہلی میں 1721ء میں پیدا ہوئے۔سوز کے والد کا نام سید ضیاء الدین تھا۔سوز کے بزرگوں کا وطن بخارا تھا دہلی میں قرول باغ میں رہتے تھے۔

سوز خاندانی نجابت کے علاوہ خود ایک بلند مرتبہ بزرگ تھے۔کم وبیش تمام تذکرہ نگاروں نے سوز کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے جس سے ان کی شخصیت وسیرت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے محترم تھے۔نیز یہ بات بھی روشن ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز شاعروں میں سے ایک تھے۔مشاعروں میں ان کا چرچہ تھا اور ادبی محفلوں میں ان کے دم سے رونقیں تھیں۔تذکروں میں ان کی قناعت پسندی اور صوفیانہ مزاج کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔سوز ادبی اوصاف کے علاوہ تیراندازی اور شہ سواری میں بھی دسترس رکھتے تھے،خوش نویسی میں بھی امتیاز حاصل تھا وہ خوش نویسی کے نسبتہً غیر مروجہ اسالیب سے بھی آشنا تھے۔

دہلی کے حالات خراب ہونے پر غالبا 1754ء میں فرخ آباد گئے اس کے بعد 1772ء میں نواب محمد یار خان امیر کے دربار ٹانڈہ میں پہنچ گئے۔حالانکہ سوز نے پہلے دعوت نامہ ملنے پر انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں چلے آئے جیسا کہ شوق نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے:

''ایں احقر یک دوملاقات درمقام محمد نگر ٹانڈہ نمودہ بسیار بتواضع وخلق پیش آمد'' ۴۳؎

ٹانڈہ کی محفل برہم ہونے پر سوز فیض آباد چلے گئے اور ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آ گئے۔۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کی وفات کے بعد مرشد آباد چلے گئے لیکن وہاں کامیابی حاصل نہ ہو پائی کہ مجبوراً لکھنؤ واپس آ گئے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔

نمونہ کلام

وائے غفلت نہ سمجھے دنیا کو
یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے

کھینچ کر تیر مر بیٹھے بس
سوز ہے یا شکار ہے کیا ہے

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے
دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

آج اس راہ دلربا گزرا
جی پہ کیا جانیے کہ کیا گزرا
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین
ایسے جینے سے اے خدا گزرا

نعیمؔ:

نعیم کا نام نعیم اللہ خان اور تخلص نعیم تھا۔ حاتم کے شاگرد تھے۔ نواب محمد یار خان امیر کی سرکار میں ایک جوان العمر اور پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ مصحفی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''فقیر اورا در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکار نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمت نواب مولف ہم در آں نزدیکی کرد و قصیدہ مدح بہ گوش حضار رسانیدہ داخل صحبت کیمیا خاصیت شد لہذا اکثر اتفاق ملاقات می افتاد۔'' [44]

نعیم ٹانڈہ کی محفل اجڑ جانے کے بعد اتر چھنیڈی چلے گئے تھے جہاں مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔

نمونہ کلام

گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا
پھر عبث تو کیوں ہوا ظالم ہمارا آشنا
شتابی عبث تو نے کی جان مضطر
ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی
آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر
جو سنگ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

خواجہ حسنؔ:

خواجہ حسن پہاڑ گنج دہلی کے رہنے والے تھے بعد میں ترک سکونت کر کے بریلی آ گئے تھے۔حسن کا سلسلہ نسب خواجہ کمہاری چشتی مودودی سے ملتا تھا جو دہلی کے معروف درویش تھے۔خواجہ حسن کی خاندان روہیلہ میں بہت قدرو منزلت تھی نواب محبت خان محبت سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔وہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، موسیقی اور درویشی میں بہت مشہور تھے۔حسن کو علم نجوم میں بھی دخل تھا اور تصوف کے رموز سے بھی آشنا تھے۔مصحفی تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں کہ:

''صوفی مذہب اکثر مسائل صوفیہ ہارا کہ مراداز وحدت وجود باشد بدلائل وبراہین چنانچہ شیوہ صوفیاں بافضل وکمال است ازروئے نص وحدیث باثبات رسانیدہ۔'' ؁۴۵

ان کو شاعری کا بھی شوق تھا ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد فیض آباد پہنچے اور وہاں سے لکھنؤ۔لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے ان کی خاطر تواضع کی۔کچھ دن بعد نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی سرکار سے منسلک ہو گئے۔انہیں ایک بازاری عورت سے عشق تھا جس کا نام بخشی تھا۔غزلوں میں وہ اس کا نام اکثر داخل کیا کرتے تھے۔

نمونہ کلام

یہی شورش عشق ہے تو الٰہی توبہ
اس آغاز کا کیوں انجام ہوگا
موئے ہم پر تو بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جاں بخشی حسن کو
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا
اشک اس کو نہیں سمجھتے ہم
جس میں لخت جگر نہیں آتا
یہ تو نے مجھ سے نالہ شبگیر کچھ نہ کہہ
یہاں دل جلایا اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہے ساری عمر میں

تقصیر یہ ہوئی کہ میں تقصیر کچھ نہ کے
مرتا ہے جاں کنی میں حسن حیف تم نے رات
اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

قائم چند پوری اور نواب محمد یار خان کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے ان کا مفصل ذکر تیسرے باب میں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ نواب حافظ رحمت خاں کی اولاد میں نواب اللہ یار خان اور نواب مستجاب خان بھی کافی مشہور ہوئے۔ نواب اللہ یار خان ادب پرور رئیس تھے۔ نواب مستجاب خان عربی، فارسی اور پشتو زبان کے ماہر اور اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔ انہوں نے اپنے والد کے حالات میں ایک کتاب فارسی میں لکھی جس کا نام گلستان رحمت ہے۔ روہیلوں کی تاریخی کتب میں گلستان رحمت سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بیش بہا کتاب باعتبار صحت واقعات اور باعتبار زبان فن انشاء پردازی ایک بہترین نمونہ ہے۔ نواب مستجاب نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف روہیلوں کے نامور سردار بلکہ ایک پوری قوم کو زندہ جاوید کر دیا۔

نواب شجاع الدولہ اور نواب حافظ رحمت خاں کی فوجوں کے درمیان 23 اپریل 1774ء کو جنگ ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور ان کا آفتاب اقبال غروب ہو گیا۔ جنگ سکرتال کے بعد اگرچہ نواب محمد یار خان امیر کی محفل سخن اجڑ گئی تھی لیکن شمع امید بالکل نہیں بجھی تھی۔ مگر جنگ روہیلہ کے بعد ریاست روہیل کھنڈ میں شاعری کا چراغ بالکل بجھ گیا۔ نہ شعرا رہے نہ شعرا نواز دربار ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ شعرا کی سرپرستی کی روایت بھی۔ مصحفی اور نواب محبت خان محبت نے لکھنؤ میں محفل سخن جمائی، وہ چراغ جو روہیل کھنڈ میں روشن تھا اس کی تنویر سے لکھنؤ جگمگایا۔ نواب محمد یار خان اور قائم چاند پوری رامپور چلے گئے جو کہ روہیل کھنڈ کا ہی ایک حصہ ہے اور وہیں فوت ہوئے۔

1774ء کے بعد روہیل کھنڈ کے مرکز یعنی علاقہ بریلی میں شعر و سخن کی جو بنیاد پڑی وہ درباداری سے مستغنی تھی۔ حافظ رحمت خاں کے صاحزادگان دو ایک کو چھوڑ کر علاقہ بریلی میں ہی رہے۔ وہ سب صاحب علم و فن تھے۔ ان میں نواب اللہ یار خان، نواب مستجاب خان حافظ الملک کے پوتوں میں نواب سعادت یار خان، عبد العزیز خان عزیز، نیاز احمد خان ہوش، نواب ظفر خان راسخ، نواب حیدر حسین خان حیدر اور نواب بہادر خاں شاعر گزرے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے ختم ہونے کے بعد بھی نوابین روہیلہ دل و جان سے اردو شاعری کی خدمت کرتے رہے جیسا کہ ریاست رامپور کے نوابین اور علاقہ بریلی میں جو نواب رہ گئے تھے ان کی خدمات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علاقہ بریلی میں نواب نیاز احمد خان ہوش کے انتقال 1892ء تک شعری ماحول ان کے قبضے میں رہا۔ اس

وقت علاقہ بریلی کے دیگر اساتذہ بھی کسی نہ کسی طرح ان کی قربت سے سرفراز ہوتے رہے۔ البتہ بیسویں صدی میں علاقہ بریلی میں خاندان روہیلہ میں کوئی قابل ذکر شاعر پیدا نہیں ہوا اور ان کی روایت شاعری علاقہ بریلی میں انیسویں صدی کے آخر میں ختم ہوگئی۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ 1774ء میں نواب شجاع الدولہ اور انگریزی افواج کے مقابلے میں روہیلوں کو شکست ہوئی تو نواب محمد یار خان قائم، کبیر اور بیجان وغیرہ کے ساتھ رامپور آ گئے اور یہاں پھر سے محفل شعر وسخن گرم ہوئی لیکن چند ماہ بعد ہی نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد رامپور میں جو ماحول شعر وسخن قائم ہوا وہ درباری سرپرستی کے بجائے عوام کی قدر دانی کا مرہون منت تھا۔ اس وقت قائم اور شاگردان قائم میں عنبر شاہ خاں آشفتہ، مولوی قدرت اللہ شوق، حکیم کبیر علی کبیر سنبھلی، عباس خان عباس کے علاوہ میر غلام علی عشرت بریلوی، تلمیذ سودا، میر ضیاء الدین عبرت، شاگرد نواب محبت خان تلمیذ، جعفر علی حسرت، مولوی غلام جیلانی رفعت، مرزا محمد اکرم آشنا، حکیم عطاء اللہ غمگین اور حکیم صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ شعرا موجود تھے جو طرحی مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔

یہ طرحی مشاعرے ابتدا میں حکیم صدر الدین خاں آزردہ کے مکان پر پابندی کے ساتھ ہر ماہ ہوتے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر منعقد ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور 1857ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی جس کو آج دبستان رامپور کے نام سے جانا جاتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔تاریخ سنبھل از حکیم ظل الرحمٰن،ص 251

2۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 36

3۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 7-8

4۔مثنوی نل دمن از فیضی، مرتب محمد طیب صدیقی، دی آرٹ پریس سلطان گنج (پٹنہ) 1987،ص 5

5۔تاریخ ادب اردو (جلد اول) از جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی)،ص 53

6۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 8

7۔اردو کی دو قدیم مثنویاں از اسمٰعیل امروہوی، مرتب نائب حسین نقوی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1970،ص 52

8۔اردو کی دو قدیم مثنویاں از اسمٰعیل امروہوی، مرتب نائب حسین نقوی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1970،ص 55

9۔اردو کی دو قدیم مثنویاں از اسمٰعیل امروہوی، مرتب نائب حسین نقوی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1970،ص 78

10۔اردو کی دو قدیم مثنویاں از اسمٰعیل امروہوی، مرتب نائب حسین نقوی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1970،ص 78

11۔اردو کی دو قدیم مثنویاں از اسمٰعیل امروہوی، مرتب نائب حسین نقوی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1970،ص 145

12۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 29

13۔اخبار الصنادید (جلد اول) از مولانا نجم الغنی، مطبع منشی نولکشور (لکھنؤ) 1918،ص 53

14۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 29

15۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب اقتدا احسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1966،ص 36

16۔طبقات الشعرا از قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1968،ص 55

17۔طبقات الشعرا از قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1968،ص 55

18۔تذکرہ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) 1985،ص 124

19۔گلشن بے خار از مصطفیٰ خاں شیفتہ، مرتب کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1973،ص 240

20۔مخزن نکات از قائم چاند پوری، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) 1985،ص 26

21۔تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) 1985،ص 87

22۔تذکرہ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند از علی ابراہیم خاں خلیل - مرزا علی لطف، مرتب محی الدین قادری زور، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) 1934،ص 161

23۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص245
24۔تذکرہ شعرائے اردواز میر حسن،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص173
25۔تذکرہ شعرائے اردواز میر حسن،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص173
26۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص253
27۔تذکرہ ہندی ازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص87
28۔مخزن نکات ازقائم چاندپوری،مرتب اقتدا حسن،مجلس ترقی ادب(لاہور)1966،ص194
29۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص337
30۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص263
31۔حیات حافظ رحمت خاں ازسید الطاف علی بریلوی،ایجوکیشنل پریس(کراچی)طبع ثانی1963،ص255
32۔حیات حافظ رحمت خاں ازسید الطاف علی بریلوی،ایجوکیشنل پریس(کراچی)طبع ثانی1963،ص256
33۔تذکرہ شعرائے اردواز میر حسن،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص180
34۔تذکرہ شعرائے اردواز میر حسن،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص182
35۔تذکرہ ہندی ازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص21
36۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص374
37۔تذکرہ کاملان رامپورازاحمد علی خان شوق،خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری(پٹنہ)،ص328
38۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص378
39۔تذکرہ گلزارابراہیم مع گلشن ہندازعلی ابراہیم خاں خلیل-مرزاعلی لطف،مرتب محی الدین قادری زور،انجمن ترقی اردواورنگ آباد(دکن)1934،ص76
40۔ریاض الفصحاازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص302
41۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص274
42۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص275
43۔طبقات الشعراازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)1968،ص231
44۔تذکرہ ہندی ازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص267
45۔تذکرہ ہندی ازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)1985،ص80

*****

باب سوم

روہیل کھنڈ کے چند نمائندہ شعرا

نواب محمد یار خان امیرؔ

نواب محمد یار خان امیر بانی ریاست روہیل کھنڈ نواب علی محمد خان روہیلہ کے چوتھے بیٹے تھے۔امیر کی پیدائش تقریباً1149ھ مطابق1735ء میں آنولہ دارالریاست روہیل کھنڈ میں ہوئی۔اور وہیں تعلیم وتربیت اور فن سپاہ میں مہارت حاصل کی۔جب بانی ریاست روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں کا1162ھ مطابق1749ء میں انتقال ہوا تو وصیت کے مطابق نواب عبداللہ خاں کو مسند نشین ہونا تھا لیکن وہ اور نواب فیض اللہ خاں احمد شاہ ابدالی کے پاس تھے۔ جس کی وجہ سے نواب علی محمد خاں کے تیسرے بیٹے نواب سعداللہ خاں کو مسند نشین کیا گیا۔چونکہ یہ کم سن تھے تو طے پایا کہ حافظ رحمت خاں کو نائب بنایا جائے تاکہ وہ ریاست کا نظام صحیح سے سنبھال سکیں۔

جب احمد شاہ ابدالی نے1752ء میں پنجاب پر دوبارہ حملہ کیا تو نواب عبداللہ خاں اور نواب فیض اللہ خاں کو روہیل کھنڈ جانے کی اجازت دے دی۔ان دونوں کے واپس آنے کے بعد نواب سعداللہ خاں کو نوابی کی کرسی سے ہٹا کر 1754ء میں ریاست روہیل کھنڈ کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔جس میں نواب عبداللہ خاں کو اچھانی اور نواب فیض اللہ خاں کو شاہ آباد بشمول رامپور کا علاقہ دیا گیا اور بقیہ روہیل کھنڈ سرداران روہیلہ میں تقسیم ہو گیا۔نواب سعداللہ خان اور نواب محمد یار خان آنولہ میں ہی رہے۔اور ان کے لیے آٹھ آٹھ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد نواب محمد یار خان اپنی ایک چھوٹی سی جاگیر ٹانڈہ نزد آنولہ جو ان کو تقسیم روہیل کھنڈ کے وقت دی گئی تھی چلے آئے۔اور اپنے سالانہ وظیفے جو سرداران روہیلہ نے ان کے مصارف کے لیے آٹھ لاکھ روپیے مقرر کیے تھے ، سے ٹانڈہ میں محلات تعمیر کرائے اور ایک چھوٹا سا دربار سجا کر شان وشوکت کے ساتھ رہنے لگے۔قدرت اللہ شوقؔ نواب موصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جوانے بود میرزا منش، نازک طبع، صاحب فطرت، اہل مروت، عالی حوصلہ وخوش سلیقہ، حاتم زمانہ، در سخاوت و جرأت یگانہ، مجمع مکارم اخلاق وبفیض رسانی وقدر دانی شہرہ آفاق و در فن موسیقی کہ بحریست ذخار و محیطی ست ناپیدا کنار، چناں دسترس تمام داشت کہ فیثا غورث با وجود استادی یکے از شاگردان ابجد خوان او، و تانسین و نایکان دکہن از مدح سرایان او۔ بسیار سخن فہم، نکتہ سنج، قدر دان سخن استادان این فن، در فرقہ اہل دول شخصے بود بے نظیر و بے بدل۔ گاہے بہ حسب صفائے ذہن و جودت طبع برائے تفنن خاطر بفکر شعر ریختہ می پرداخت و داد سخنوری و خوش تلاشی می داد۔ در اندک ایام مشق او برتبہ عالی استادان رسیدہ بود، فاما اجلش مہلت نہ داد۔'' [1]

نواب صاحب کو جب شاعری کا شوق ہوا تو انہوں نے میر سوزؔ اور مرزا سوداؔ جو اس وقت نواب مہربان خان رند کی محفل سے منسلک تھے کو دربار میں آنے کی دعوت دی لیکن ان دونوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد کبیر سنبھلی جو نواب صاحب کے معالج تھے اور شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے کے مشورے پر قائمؔ چاند پوری جو اس وقت بسولی میں نواب دوندے خاں کی سرکار میں ملازم تھے کو آنے کی دعوت دی۔ اور سو روپے ماہوار مقرر کر کے ان کے شاگرد ہو گئے۔ جیسا کہ مصحفی نے لکھا ہے:

''درایامیکہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبلی شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوئے خود کشید، خطی بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع سودا نوشتہ کرد۔ چوں در آں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خان رند تخلص بصیغہ شاعری عز و امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود نیفتاد۔ آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام در بسولی بودند حسب الاشارہ آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت۔ و بدر ماہہ صد روپیہ غرور امتیازش دادہ باستادیش برداشت''

[2]

امیر کے اس چھوٹے سے دربار میں ان کی قدر دانی اور داد و دہش کی بنا پر قائمؔ اور کبیر سنبھلی کے علاوہ مصحفی، پروانہ علی شاہ پروانہؔ مراد آبادی، عشرت ہزالؔ، عزیز خاں ہیجانؔ، فدویؔ لاہوری اور محمد نعیم وغیرہ جمع ہو گئے۔ قدرت اللہ شوقؔ نے لکھا ہے کہ آخر میں میر سوزؔ بھی فرخ آباد سے ٹانڈہ آ گئے تھے۔ لکھتے ہیں:

''ایں احقر یک دو ملاقات در مقام محمد نگر ٹانڈہ نمودہ بسیار بتواضع وخلق پیش آمد۔'' [3]

نواب صاحب کو شاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور ستار بجانے میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اس فن میں تان سین کے خاندان کے کئی ماہرین موسیقی سے کمال حاصل کیا

تھا۔

یہ علم انہوں نے کس سے سیکھا صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے حالات خراب ہونے کی بناء پر متعدد اہل کمال نے روہیل کھنڈ کا رخ کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی محمد خاں کے دربار آنولہ میں تان سین کے خاندان کے دو اہم استادانِ فن فیروز خان اور گلاب خان موجود تھے۔نواب محمد یار خاں نے ان سے یا ان کے شاگردوں سے یہ فن سیکھا ہوگا۔اسی وجہ سے خود ٹانڈے میں ان کے دربار میں کئی موسیقار موجود تھے۔اس کے علاوہ نواب موصوف مصوری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔انہوں نے عاقل خاں مصور سے تمام درباری شعرا کا ایک مرقع تیار کرایا تھا جو ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔

نواب صاحب نے ان فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ہر ایک فرد کی خوب قدر و منزلت کی۔لیکن جب شاہ عالم ثانی نے مرہٹوں کی مدد سے نواب ضابطہ خان خلف نواب نجیب الدولہ والی نجیب آباد پر 1772ء میں فوج کشی کی تو نواب موصوف بھی ان کی مدد کے لیے سکرتال پہنچے۔اس جنگ میں ضابطہ خان کو شکست ہوئی جس کا اثر روہیل کھنڈ پر بھی پڑا۔مرہٹوں نے اپنی پرانی رنجش کی وجہ سے روہیل کھنڈ میں لوٹ مار شروع کر دی جس کی وجہ سے شعرا حضرات کو ٹانڈہ چھوڑ کر جانا پڑا۔دربار میں صرف کبیرؔ سنبھلی (چونکہ وہ نواب صاحب کے معالج تھے) اور قائمؔ چاندپوری (جن سے نواب صاحب شاعری سیکھتے تھے) رہ گئے۔

اس کے بعد 1774ء میں میران پور کٹرہ میں جب شجاع الدولہ اور انگریزی افواج کے ساتھ روہیلوں کی جنگ ہوئی تو اس میں حافظ رحمت خان شہید ہو گئے اور نواب موصوف نے خود کو شجاع الدولہ کے حوالہ کر دیا۔جس کے نتیجہ میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور ریاست رامپور کے علاوہ پورے روہیل کھنڈ پر اودھ کا قبضہ ہو گیا۔نواب فیض اللہ خان نے جنگ جاری رکھی جس کے نتیجہ میں معاہدہ لال ڈنگ عمل میں آیا اور اس میں طے پایا کہ ریاست رامپور کو ان کے لیے چھوڑ دیا جائے۔جب یہ معاہدہ ہو گیا تو نواب فیض اللہ خاں اپنے بھائی نواب محمد یار خان کو شجاع الدولہ سے آزاد کرا کر رامپور لے آئے اور پچاس ہزار روپے سالانہ ان کے مصارف کے لیے مقرر کیے۔

نواب صاحب کے رامپور آجانے کے بعد قائمؔ چاندپوری اور کبیرؔ سنبھلی بھی رامپور چلے آئے۔محفل شعر و سخن پھر سے گرم ہوئی اور شعرا حضرات جمع ہونے لگے جن میں سے کچھ نواب موصوف کے مصاحبین بھی بنے۔احمد علی خاں شوقؔ لکھتے ہیں:

''نواب صاحب نے غسل صحت کی خوشی میں ڈوم دھاریوں کو خلعت اور بہت روپے دیے۔

اسی طرح مصاحبین کو مثل سید حسن شاہ۔ ومیر ضیاء الدین عبرت۔ ومیر محمد قاسم شاعر اور میاں
معزالدین وغیرہ کو خلعت دوشالے تھان کمخواب اور بنارسی دوپٹوں سے دیے۔'' [۴]

غسل صحت کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز نواب صاحب کی آنکھ میں سال کی لکڑی کا ایک ریزہ گھس گیا۔ تو حکیم کبیر سنبھلی نے محمد حیات جراح کو بلا کر اس ریزہ کو نکلوایا جس کی وجہ سے آنکھ سے خون بہنے لگا۔ حکیم صاحب نے فوراً دوا لگا کر آنکھ پر پٹی باندھ دی۔ تیسرے دن جب پٹی کھولی تو آنکھ کچھ حد تک ٹھیک ہو چکی تھی لیکن شدید سرخی باقی تھی۔ ایک ہفتہ کے علاج کے بعد وہ بھی ٹھیک ہو گئی۔ اسی صحت یابی کی خوشی میں نواب صاحب نے غسل صحت فرما کر لوگوں کے درمیان خلعت وغیرہ تقسیم کیں۔

لیکن علالت نے دوبارہ زور پکڑا جس کی وجہ سے نواب صاحب کا غرہ ماہ ذوالقعدہ 1188ھ مطابق 3 جنوری 1775ء کو انتقال ہو گیا۔ جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے:

''صاحبزادہ ممدوح نے مستسقی اور مسلول ہو کر غرہ ماہ ذوالقعدہ کو گیارہ سو اٹھاسی ہجری میں
رحلت فرمائی'' [۵]

نواب صاحب کو کئی فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی وہ مصوری اور موسیقی میں دستگاہ رکھتے تھے، ستار بجانے میں کمال حاصل تھا اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ نواب صاحب نے شاعری میں غزلیات، قصائد، مثنویات، مسدسات، رباعیات اور قطعات تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا دیوان محفوظ نہ رہ سکا۔ فی الحال ان کا بس وہی کلام موجود ہے جو تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکروں میں نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

نواب صاحب ایک ذکی و ذہین انسان تھے جس فن کا بھی انھیں شوق ہوتا بہت جلد اس کو سیکھ کر اس پر قدرت حاصل کر لیتے لہٰذا جب انھیں شاعری کا شوق ہوا تو اس میں بھی بہت جلد مہارت حاصل کر لی اور ایک قادرالکلام شاعر اور سخن شناس کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

نواب صاحب کے کلام کا جب مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں پختگی اور استواری بخوبی موجود ہے اور ساتھ ہی ان کے رنگ سخن پر چاشنی، دل فریبی اور ہلکی ہلکی درد کی لہر بھی نظر آتی ہے۔ نواب صاحب کو کیفیت عشق کے اظہار کا ملکہ حاصل تھا اسی لیے ان کی شاعری میں جا بجا اظہار درد نظر آتا ہے انھوں نے زندگی کی سچائیوں سے لطف اندوز ہونا سیکھا تھا چنانچہ ان کی شاعرانہ جھلکیاں ان کے دل کی اندرونی دنیا کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

یہ مت سمجھو کہ میں زیر فلک مختار پھرتا ہوں
برنگ سایہ مرغ ہوا ناچار پھرتا ہوں

پایا تو عروج آسماں تک
پر صورت شعر ڈھل گئے ہم

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ڈریو اے دل نہ جان کی خاطر
مرد مرتے ہیں آن کی خاطر

نواب صاحب کے یہاں حزن ویاس، بے رنگی زیست اور تصوفانہ فکر وخیال کے مضامین بھی اپنی گہرائی و گیرائی کے ساتھ بکثرت پائے جاتے ہیں انھیں حقیقتوں کو خیال اور خیالات کو حقیقت کا پیرہن دینا بخوبی آتا ہے ان کے یہاں دنیا کی بے ثباتی، فنائیت اور صداقت و واقعیت بھی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کہاں کی عمر کس کی زیست یہ عمر
حباب آسا ہے جھگڑا اک نفس کا

ماہیت خلق خوب سمجھے
پر آپ سے بے خبر گئے ہم

جاہ دنیا پہ اعتماد ہے کیا
مہر بعد از عروج ڈھلتا ہے

کن حسرتوں سے چھوڑ کے ہم یہ جہاں چلے
آئے تو حد سبک تھے پہ کتنے گراں چلے

جوں نقش قدم نام کو ہستی ہے ہماری
اک باد کے جھونکے میں نہ ہم ہیں نہ نشاں ہے

کیوں سیل کچھ خبر بھی تجھے ہے کہ مثل موج
جائیں گے کس طرف کو ہیں آئے کدھر سے ہم

کس زیست پہ مانند حباب اتنی ہوس آج
ہونا ہے ہوا کل کو جو ہے تن میں نفس آج

نواب صاحب کے یہاں خمریات کی جھلک بھی نظر آتی ہے جابجا رندو ساقی اور پیمانہ و مینا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کیا تونے دیا تھا مجھ کو ساقی
شیشے میں تو واہ کچھ نہ نکلا

ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے
ہم دلوں میں آپ مزہ ہے کباب کا

عام طور پر صوفی مزاج شعرا کے یہاں عشق مجازی کے اظہار کا کھلا رنگ نہیں پایا جاتا لیکن تعجب ہے نواب صاحب کے یہاں یہ دونوں طرزیں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں ایک طرف وہ حقائق عالم اور زندگی کی سچائیوں پر فلسفیانہ مصرعے چھیڑتے ہوئے نظر آتے ہیں جن میں تصوفانہ پہلو اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہیں وہیں دوسری طرف ان کی شاعری میں معاملہ بندی، محبوب کی قاتلانہ ادائیں، دلربائیاں، غمزہ وعشوہ گری اور ناز ونزاکت بھی بھرپور ہے، عشق مجازی کی کیفیتوں کا اظہار پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

گر وقت ذبح نالہ کیا میں تو کیا ہوا
پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

ہائے رے سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب
جس قدر بگڑے ہے اتنا ہی سنور جاتا ہے

جی بھی دے ہے کوئی پہ ہم نے دیا
کیا کریں اک جوان کی خاطر
داغ دل لے چلے گلی سے تری
چاہیے کچھ نشان کی خاطر

تاب کیا آئنہ کو ہووے مقابل تیرے
سامنے ہوکے ترے شمس و قمر دیکھیں تو

جو حالت درد دل کی دل پہ گزرے ہے سو دل جانے
یہ دل کی بات ہے دلبر کسی بے دل سے مت کہیو

پوچھا میں میاں دل تو نہیں زلف میں تیری
بل کھاکے لگا کہنے میاں لیتے ہو ہاں ہے

شوخیاں اپنے لڑکپن کی نہ کچھ پوچھ میاں
کون سا دل تھا کہ ہاتھوں سے ترے چور نہ تھا

نواب صاحب کے طرز سخن پر ہلکی سی سنجیدگی کی کیفیت طاری رہتی ہے ان کا سخن جو کہہ رہا ہوتا ہے محسوس ہوتا

ہے۔ بہر کیف ان کے یہاں کیف وسرور، سر مستی وبیخودی، دیوانگی، تصوف اور اخلاقی اقدار کی جھلکیاں صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں ان کے یہاں مجازی اور حقیقی عشق آپس میں گلے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

****

حواشی

1۔طبقات الشعرا از قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1968، ص 422

2۔تذکرہ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنو) پہلا اکادمی ایڈیشن 1985، ص 21

3۔طبقات الشعرا از قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1968، ص 231

4۔تذکرہ کاملان رامپور از احمد علی خاں شوق، لبرٹی آرٹس پریس (مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس) دریا گنج نئی دلی، طبع ثانی 1986، ص 327

5۔انتخاب یادگار از امیر مینائی، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنو) پہلا اکادمی ایڈیشن 1982، ص 31

***

قائم چاند پوری

قائم شعرائے روہیل کھنڈ کی 185ء تک کی فہرست میں سب سے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے نہ صرف اعلیٰ شاعری کی بلکہ روہیل کھنڈ جہاں شعرا بغیر کسی سرپرستی کے شعروسخن میں طبع آزمائی کر رہے تھے ان پر اپنا ہاتھ رکھا، فکر دی اور شعروسخن کی راہوں کو ہموار کیا۔ اور ساتھ ہی سلسلہ تلامذہ بھی شروع کیا جس نے آگے چل کر نہ صرف روہیل کھنڈ کو شاعری کے میدان میں گلستاں بنایا بلکہ ایک دبستان کی حیثیت بھی بخشی۔

قائم چاند پوری کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکروں میں مختلف طرح سے لکھا ہے۔ کسی نے محمد قائم تو کسی نے قیام الدین علی تو کسی نے قیام الدین محمد قائم لکھا ہے لیکن قائم نے خود اپنا نام قیام الدین لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''آلودہ انواع جرائم، فقیر مولف قیام الدین قائم۔'' ؂۱

اس شہادت کی روشنی میں ہر تذکرہ نگار کی رائے جس نے ان کا نام محمد قائم یا کچھ اور لکھا ہے درست نہیں ہے۔ تخلص قائم تھا اور چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ قائم کی پیدائش چاند پور میں لگ بھگ 1722ء میں ہوئی۔ اقتدا حسن لکھتے ہیں:

''ولادت تقریباً ۱۱۳۵ھ مطابق 1722ء بمقام چاند پور ضلع بجنور۔'' ؂۲

قائم نے اپنے چاند پور کے حالات یا دہلی کب آئے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا بس اتنا لکھا ہے:

''اما از بدو شعور تا بایں حال بہ توسل نوکری بادشاہی بہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد گذرانده۔'' ؂۳

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ دہلی کب آئے۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد سے تالیف تذکرہ 1755ء تک شاہی ملازمت میں رہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دہلی سے تعلق زمانہ ملازمت سے

رہا یعنی 16 / 17 کی عمر سے۔ لیکن مخزن نکات میں ناجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے بچپن میں ناجی کو اپنے بھائی منعم کے گھر دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

''با برادر فقیر کہ منعم تخلص می کرد۔۔۔ ربط اتحاد مربوط داشت، گاہ گاہ بہ غریب خانہ تشریف می آورد۔ بندہ در خرد سالی اورا دو سہ بار دیدہ ام۔'' ۴۲

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائم بچپن میں اپنے بھائی کے یہاں دہلی میں آتے جاتے رہتے تھے یا مستقلاً دہلی میں ہی رہتے تھے۔

جب قائم سن شعور کو پہنچے تو بادشاہ کی سرکار میں توپ خانے میں ملازم ہو گئے۔ جب 1753ء میں عماد الملک نے مرہٹوں کی مدد سے وزارت پر قبضہ کر کے احمد شاہ کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا اور عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت سلطنت پر فائز کر دیا۔ تو اسی افراتفری کی وجہ سے قائم کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ ملازمت سے خالی ہونے کی بنا پر اپنا تذکرہ مخزن نکات لکھنے کا ارادہ کیا اور 1754 / 55ء تک اس کو مکمل کر لیا لیکن قائم تذکرہ کی تکمیل کے بعد بھی دہلی میں ہی رہے۔ 1757ء کے لگ بھگ قائم دہلی سے رخصت ہو کر اپنے وطن چاند پور پہنچے۔ لیکن چاند پور میں آمدنی کے ذرائع کم تھے اور روز بروز معاشی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا جس کی وجہ سے تلاش معاش کی خاطر امروہہ، سنبھل اور مراد آباد وغیرہ میں بھٹکتے رہے آخر بسولی پہنچے اور نواب دوندے خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد 1771ء میں جب نواب محمد یار خاں نے قائم کو ٹانڈہ آنے کی دعوت دی تو قائم بسولی سے ٹانڈہ چلے آئے۔ نواب صاحب نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر کے شاعری میں ملازمت پر رکھ لیا۔ جہاں سے روہیل کھنڈ میں باقاعدہ محفلین منعقد ہونا شروع ہوئیں اور باقاعدہ شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ جنگ سکرتال 1772ء کے نتیجہ میں جب ٹانڈہ کا دربار ختم ہوا تو یہ محفل بھی برہم ہو گئی۔ جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو قائم دوبارہ ٹانڈہ آ گئے لیکن معرکہ میراں کٹرہ 1774ء میں نواب شجاع الدولہ کے ہاتھوں حافظ رحمت خاں کو شکست و شہادت ہوئی جس کی وجہ سے پورا روہیل کھنڈ متاثر ہوا۔ شجاع الدولہ نے اس کے اکثر حصوں پر اپنا قبضہ جما لیا لیکن معاہدہ لال ڈنگ کی وجہ سے نواب فیض اللہ خاں رامپور کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ نواب محمد یار خان قائم اور دیگر اساتذہ و شعراء کے ساتھ رامپور چلے آئے لیکن نواب محمد یار خان یہاں دو ماہ بھی زندہ نہیں رہ پائے کہ انتقال کر گئے جس کی وجہ سے قائم پھر سے بے یار و مددگار ہو گئے۔ اس کے بعد 1777ء کے لگ بھگ لکھنؤ چلے گئے۔ اقتدا احسن لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں قائم کی آمد کی صحیح تاریخ کا تعین نہیں ہو سکتا البتہ یہ واضح ہے کہ وہ 1190ھ کے

لگ بھگ آئے ہونگے۔'' ۵؎

یہیں شاہ کمال صاحب مجمع الانتخاب قائمؔ کے شاگرد ہوئے۔قائم لکھنؤ میں دو تین سال رہے اس کے بعد نواب احمد یار خان کے بلاوے پر رامپور چلے گئے۔قیام رامپور کے دوران قائم نے ایک دفعہ اور لکھنؤ کا سفر کیا تھا جب شہزادہ سلیمان شکوہ دہلی سے فرار ہوکر لکھنؤ میں اپنا دربار جمائے ہوئے تھا۔یہاں قائم نے شہزادہ کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جو کلیات قائم میں موجود ہے۔مصحفیؔ نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کے دوران قیام میں قائم نے اپنے قدیم دیہات، ملک اور یومیہ واگزاشت کرنے کی کوشش کی اور آصف الدولہ کے دیوان راجہ ٹکیٹ رائے بہادر سے چاندپور کے عامل کے نام شقہ جات و پروانہ جات حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''اما او قاتش در آں بہ فراغت نمی گذشت لہذا برائے رہا کردن دیہات قدیم ملک و یومیہ و غیرہ قصبہ مذکور در لکھنؤ گذرا فگندہ واز راجہ ٹکیٹ رائے بہادر شقہ جات و پروانہ جات بنام عامل آنجا درست کنانیدہ بردہ بود کہ بعد فائز شدن'' ۶؎

اس کے بعد قائمؔ چاندپور ہوتے ہوئے رامپور چلے گئے اور یہیں 1792 یا 93ء میں وفات پائی اور نواب محمد یار خان کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

اساتذہ:

قائمؔ نے ابتدا میں ہدایت اللہ ہدایت کو اپنے اشعار دکھائے۔قائمؔ کا ان کے ساتھ تعلق زیادہ دن نہیں رہا۔ان کے بعد قائمؔ نے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کر لی۔اور ان کے بعد باقاعدہ سودا کی شاگردی میں چلے گئے۔جس کی طرف میر نے بھی اشارہ کیا ہے کہ ایک مدت تک میر درد صاحب کے گروہ میں شامل رہے لیکن اب مرزا رفیع سوداؔ کے ساتھ شامل ہیں۔میرؔ لکھتے ہیں:

''مدتے داخل جرگہ میاں خواجہ میر صاحب ماند۔اکنوں با مرزا رفیع محشور است'' ۷؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب میرؔ نے نکات الشعرا لکھا تو اس وقت تک قائمؔ سوداؔ کی شاگردی میں آ گئے تھے۔ قائمؔ جس وقت دردؔ کے شاگرد تھے تو ہدایت اللہ سے ان بن ہوگئی جس پر قائم نے ایک ہجویہ قطعہ کہا جس میں درد کو استاد زماں کہہ کر خطاب کیا اور ان سے ہدایت کو سیدھا کرنے کی اجازت طلب کی:

حضرت درد کی خدمت جب آ قائم
عرض کی یہ کہ اے استاد زماں سنتے ہو

امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھو کج طینت
تیر بنتے بھی کہیں شاخ کماں سنتے ہو

ہدایت اللہ نے بھی اس کا جواب دیا اور کہا:

چشم انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم
چاہیے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمہارے ہو گھمنڈ
کہہ چکے ہم تو غزل، بارے تم ارشاد کرو

اسی طرح ایک دفعہ اپنی جنگی غزل میں سوؔدا کو بکری اور خود کو شیر کہا جس پر سودا نے ایک پوری مثنوی لکھ دی اور ایک شعر میں پوچھا:

کون اس میدان میں بکری، کون شیر
بولیے جلدی سے اب کیجیے نہ دیر

جب بات بڑھی تو نواب نعمت اللہ خاں بیچ میں آئے اور صلح صفائی کروائی اور سوؔدا نے مثنوی سے قائمؔ کا نام نکال کر ایک فرضی نام فوقی ڈال دیا۔ ڈاکٹر اقتدا حسن لکھتے ہیں:

"راقم کی نظر سے کلیات سودا کا ایک ایسا مخطوطہ بھی گزرا ہے جس میں یہ ہجو اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ اس میں کہیں 'فوقی' کی بجائے 'قائم' درج ہے اور کہیں متن میں 'فوقی' ہے اور حاشیہ پر 'قائم'۔" [8]

لیکن قائمؔ سودا کو بہت مانتے تھے جس کی طرف انہوں نے اپنے ایک قصیدہ میں بھی اشارہ کیا ہے جو کہ سوؔدا کی مدح میں ہے۔ اس قصیدہ میں قائمؔ نے سوؔدا کو افصح الفصحا، پیمبر اہل سخن اور سخن پناہا کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اور سوؔدا کی استادی کا اعتراف اس طرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

قائم تو جی لگا کے نہ کہیو یہ ریختہ
ہونا پڑے گا حضرت استاد کی طرف

قائم بہ فیض صحبت سودا ہے ورنہ میں
طرحی غزل سے میر کے آتا تھا بر کہیں

قائم جلد غصہ کرنے والے انسان تھے جب ان کو کسی پر غصہ آتا تو اس پر ہجو لکھ دیتے۔ کلیات قائم میں اس طرح کی کئی ساری ہجویات ہیں جن کو قائم نے ناراضگی کے سبب کہا ہے۔ قائم جب میر سے ناراض ہوئے تو ان کو بھی ایک رباعی میں میر خمیر لکھ دیا اور ان کے سید ہونے کے بجائے نانبائی ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

قائم کے مزاج میں دو طرح کے مزاج نظر آتے ہیں ایک حسن پرستی اور دوسرا تصوف کی طرف میلان۔ میر درد سے ان کی عقیدت اور مشورہ سخن تصوف کی طرف میلان کا پتہ دیتا ہے۔ قائم نے اپنی طویل مثنوی رمز الصلوۃ میر درد کے رسالے اسرار الصلوۃ سے متاثر ہو کر ہی لکھی۔ جب جوانی گزر گئی تو آخر میں درویشی اختیار کر لی جس کی طرف مصحفی نے اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں:

''فقیر اورا در ایام ذو موی بہ لباس درویشی در سرکار نواب محمد یار خان کہ در آں روز ہا تازہ دارد بود دیدہ۔'' 9

قائم کو بھی سودا کی طرح امراء و نوابین کی صحبت پسند تھی کیوں کہ معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا اور معاشرے میں عزت و احترام حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ تھا۔ مزاج میں یکسانیت پائے جانے اور سودا کے اس وقت امراء و نوابین کے ساتھ اچھے تعلقات ہونے کی وجہ سے ہی قائم نے سودا کی شاگردی اختیار کی ہوگی۔

تصانیف:

قائم کے ذخیرہ تصانیف میں صرف دو تصانیف ہیں ایک کلیات قائم اور دوسری مخزن نکات۔

کلیات قائم ان کی ساری شاعری پر مشتمل ہے جس میں 407 غزلیں، 99 رباعیات، 2 مستزاد رباعیاں، 32 قطعات، 4 متفرقات، 7 مخمسات، 2 مسلسات، 1 ترجیع بند، 13 قصائد، 11 حکایات، 12 مختصر مثنویاں، 3 طویل مثنویاں، 3 سلام، 4 مراثی۔ اس کے علاوہ فارسی میں 23 غزلیں، 4 رباعیات، 3 قطعات اور ایک سلام بھی شامل ہیں۔

کلیات قائم کو ڈاکٹر اقتدا حسن نے مرتب کر کے پہلی بار 1965ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر خورشید الاسلام نے دیوان قائم مرتب کر کے 1963ء میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ کلیات اور دیوان دونوں کا متن انڈیا آفس لائبریری کے نسخے پر مبنی ہے۔ 1903ء میں عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے انتخاب

دیوان قائم کومرتب کر کے مدراس سے اور 1905ء میں مولانا حسرت موہانی نے انتخاب دیوان قائم کومرتب کر کے علی گڑھ سے دیوان قائم کے الگ الگ دو انتخاب شائع کیے تھے۔

قائم نے کم وبیش ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی روایت کو پھیلانے اور آگے بڑھانے میں میر وسودا کی طرح کام کر کے شعر گوئی کا ایک معیار قائم کیا۔ زبان کو اظہار کی توانائی دی، نئے نئے امکانات کو ابھارا اور اردو شاعری کو ایسے اشعار دیے جو اردو زبان کے تخلیقی سرمائے کی آج بھی آبرو ہیں۔

قائم کے اشعار کی خاصیت ان کی انفرادیت کا مظہر ہے وہ عشق کے تجربات کی رنگارنگی اور زندگی کی مزاج شناسی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قائم زندگی کی دھوپ چھاؤں اس کے نشیب وفراز اور اس کے مختلف النوع تجربات سے گزرے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں ایک طرح کا پختہ پن نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

شراب عشق میں کیا جانے کیا بلا تھی ملی
کہ جس کے کیف کا اب تک خمار باقی ہے

ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے
کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گزر گئے

میں دوانہ ہوں سدا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

قائم کے ایسے اور کتنے اشعار ہیں جو اردو شاعری کے انتخاب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان میں اردو غزل کی روایت بھرپور انداز میں نظر آتی ہے جن سے آنے والے شعرا نے خوب فیض اٹھایا۔ ان اشعار میں ایک ایسا انداز ہے جس سے قائم کو پہچانا جا سکتا ہے۔

قائم کا کلام ان کی شخصیت اور ان کے ذاتی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ان کے دور کی ناآسودگی اور تشنگی ان کے اشعار میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔قائم اپنی غزلوں کی علامات میں اپنے عہد کی بدحالی اور پراگندگی کی طرف بالواسطہ اشارے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔چند اشعار دیکھیے:

نہ کر غرور تو منعم کہ دم میں مثل حباب
بہ باد جاتے میں دیکھا ہے چتر شاہی کا

بد ہیں اپنے نصیب گر قائم
خوبی روزگار سے کیا حظ

قائم وطن کے بیچ تو آسودگی نہ ڈھونڈ
پر خار گلستاں میں ہمیشہ ہیں پائے گل

قائم کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو غزل کو ارتقائی منزلوں کی طرف گامزن کیا۔اسی وجہ سے قائم کو اپنے اشعار پر ناز بھی تھا کہ انہوں نے اردو شاعری کو ریختہ کی منزل سے غزل گوئی تک پہچانے میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔مثلا:

فقط شاعر نہیں ہم بلکہ قائم
ہمارا ایک ادنی یہ بھی فن ہے

قائم ہیں ریختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

قائم نے غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کے کلیات میں رباعیات،قطعات، مخمسات،ترجیع بند،قصائد،حکایات اور طویل ومختصر مثنویاں بھی ہیں۔ان سب اصناف میں قائم نے اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا پورا ثبوت دیا ہے۔

کلیات قائم میں 13 قصیدے ہیں جن میں سے ایک در نعت حضرت سرور کائنات ہے اور دوسرا در منقبت

جناب مرتضیٰ ہے۔ان کے علاوہ دس قصیدے آصف الدولہ، شاہزادہ سلیمان شکوہ، میر بخشی ہندوستان، امیر الامرا نواب نعمت اللہ خان اور دوسرے امراء کی شان میں لکھے گئے ہیں اور ایک قصیدہ مرزا سوداؔ کی مدح میں بھی لکھا ہے۔ان سب قصائد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پر گو، قادر الکلام شاعر قصیدہ لکھ رہا ہے جس نے قصیدے کی ہیئت کو پورے طور پر قائم رکھا ہے۔ان سب قصیدوں میں سب سے اچھا قصیدہ وہ ہے جو سوداؔ کی مدح میں لکھا گیا۔

قائمؔ نے ہجویات بھی لکھی ہیں۔ان ہجویات کا جب مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ قائمؔ عام طور پر گالیوں پر اتر آتے ہیں۔در ہجو پتنگ باز، در مذمت گوزی، در ہجو حجام اور در ہجو قاضی ان سب ہجویات میں قائمؔ کا غصہ ان کا پھکڑ پن صاف نظر آتا ہے۔قائمؔ کی ہجویات میں در ہجو شدت سرما سب سے زیادہ دلچسپ اور قائمؔ کی سب سے بہترین ہجو ہے۔ اس میں سردی کی شدت کو جس شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے اسے پڑھ کر نہ صرف سردی کی شدت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ذہنی طور سے ہم اس کیفیت میں شریک بھی ہو جاتے ہیں۔اس کا پہلا شعر ہی ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے:

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

اس ہجو میں شاعرانہ مبالغے نے طنز و مزاح کی کیفیت کو گہرا کر دیا ہے اور یہ ہجو ایک اجتماعی کیفیت کی ترجمان بن گئی ہے اسے اردو کی بہترین ہجویات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

قائمؔ نے مثنوی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی حکایات نظم کی ہیں۔ان سب حکایات میں پند و نصیحت کے بے ساختہ اظہار، طرز کی سادگی و روانی سے ایک ایسا فنی اثر پیدا ہو گیا ہے جو ان حکایات کو اردو میں ایک نئی صنف سخن کی شکل دیتا ہے۔ یہ حکایات مثنوی کی ہیئت و روایت کا ایک حصہ ضرور ہیں لیکن قائمؔ نے ان حکایات کو مثنوی سے الگ کر کے ایک مربوط نظم کی صورت بخشی ہے۔

کلیات قائمؔ میں ایک مخمس شہر آشوب قابل ذکر ہے۔شہر آشوب میں قائمؔ نے معرکہ سکرتال جس میں مرہٹوں نے شاہ عالم ثانی کے ساتھ مل کر نواب ضابطہ خان پر حملہ کر کے روہیل کھنڈ پر ایک شدید چوٹ لگائی تھی کو موضوع سخن بنایا ہے اور درد بھرے انداز میں اس جنگ سے پیدا ہونے حالات، افلاس، بدحالی اور معاشی و معاشرتی تباہی کو بیان کیا ہے۔اس شہر آشوب میں نہ صرف شاہ عالم ثانی کو بھڑوا، خبیث خر کہا گیا ہے بلکہ اسے اس تباہی کا اصل ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا ہے۔اسی وجہ سے یہ شہر آشوب ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس سے وہ زاویہ نظر سامنے آتا ہے جو جنگ سکرتال کے تعلق سے اس دور کی تاریخوں میں نہیں ملتا۔

قائم نے طویل مثنویاں بھی لکھی ہیں۔مثنوی رمزالصلوت جو254اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں نماز کی حقیقت اور ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہےاور سبق آموز حکایات سے اخلاقی نتائج اجاگر کیے گئے ہیں۔قائم نے یہ مثنوی میر درد کے رسالے اسرارالصلوت سے متاثر ہوکرلکھی تھی۔اس مثنوی میں شگفتہ انداز میں ظاہر و باطن کےفرق کوواضح کر کے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔

قصہ نٹ مسمی بہ حیرت افزا:

یہ مثنوی قائم کی مثنویوں میں سب سے قابل ذکر مثنوی ہے۔اس مثنوی کو قائم نے مشق کی ترغیب کے لیے ایک رات میں ہی لکھ دیا تھا۔

ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا وہ اہل فن کا بڑا قدر دان تھا۔اس نے شہر کے تمام اہل فن کو بلایا اور اپنے اپنے کمالات دکھانے کے لیے کہا۔جب تمام اہل فن اپنے اپنے کمالات کا مظاہرہ کر چکے تو ایک بازیگر حاضر ہوااور اجازت طلب کی۔اجازت ملتے ہی گیت پرڈھول بجنے لگےاور ایک عورت پری نما سامنے آئی اور میدان میں دو اونچے بانس نصب کر دیے۔ان پر ایک رسی باندھی اور سر پر گھڑے رکھ کر بڑے ناز واداسے ایک طرف سے دوسری طرف چل کرا سے پار کر دیا۔جب نیچے اتری تو وہ شخص سامنے آیا اور رسی پر چڑھ کر اپنے سر کو خنجر پر رکھ کر الٹا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف سے دوسری طرف گزر گیا۔بادشاہ نے اسے انعام واکرام سے نوازا۔نٹ نے عرض کی کہ شاہ پناہ!اب دل میں کوئی آرزو نہیں ہے۔مگر جی چاہتا ہے کہ جن سے جا کر ایک بار جنگ کروں کیونکہ جن نے میرے باپ دادا سب لوگوں کو مار دیا ہے۔آپ میری نٹنی بطور امانت اپنے پاس رکھ لیجیے۔یہ کہا اور کمر سے ہتھیار باندھے اور اسی وقت اس کے بازوؤں پر پر ظاہر ہوئے اور وہ ہوا میں اڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔اتنے میں تیز ہوا چلنے لگی،ابر گرجنے لگا۔ابھی یہ عمل ہو رہا تھا کہ آسمان سے خون ٹپکنے لگا۔کچھ دیر بعد آسمان سے ایک ہاتھ گرا،پھر سینہ،پیر اور سر بھی زمین پر آ گرے۔یہ دیکھ کر نٹنی کا برا حال ہو گیا۔اس نے خون کو زمین سے سمیٹا اور منہ پر مل لیا اور شدت غم سے رونے لگی۔کچھ دیر بعد نٹنی نے بادشاہ سے کہا کہ میں ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔مجھے ستی ہونے کی اجازت دیجیے۔شدید اصرار پر بادشاہ نے اجازت دے دی نٹنی ایک پل میں جل کر راکھ ہو گئی۔یہ دیکھ کر بادشاہ کا حال خراب ہو گیا اور وہ بیما رہنے لگا۔کمر جھک گئی،رنگ زرد ہو گیا۔اعیان دولت نے ہر طرح کا علاج کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔بالآخرانہوں نے طے کیا کہ ویسا ہی جشن پھر ترتیب دیا جائے۔جب بزم آراستہ ہوئی اور بادشاہ کرسی پر بیٹھا تو وہی بادتند پھر چلنے لگی اور وہ نٹ پھر آن موجود ہوا۔جھک کر سلام کیا اور کہا میں نے اقبال شاہی سے جن کو شکست دے دی ہے اور وہ میری تیغ کے

خوف سے سمندر میں جا چھپا ہے۔ میں نے عاجز دیکھ کر اسے چھوڑ دیا ہے اور پھر کہا میں جلدی میں ہوں میری عورت مجھے عنایت فرما دیجیے۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ عورت تو تیرے فراق میں جل کر بھسم ہوگئی۔ نٹ کو یقین نہ آیا اس نے جلی کٹی باتیں کیں اور ایک ہنگامے کے بعد رائے ٹھہری کہ نٹ چل کر وہ جگہ دیکھ لے جہاں نٹنی جل کر راکھ ہوئی تھی۔ نٹ نے وہاں پہنچتے ہی آواز دی کہ اے نٹنی تجھے شاہ نے کہاں بند کیا ہے۔ یہ آواز سنتے ہی نٹنی نے پردہ ہٹایا اور زیب وزیور سے آراستہ باہر نکلی۔ نٹنی کو دیکھ کر نٹ نے بادشاہ کی امانت داری کی تعریف کی اور کہا کہ اے بادشاہ آپ کی یہ حالت اس نٹنی کی وجہ سے ہے۔ میں اس سے ہاتھ اٹھاتا ہوں آپ اسے پسند کیجیے۔ یہ سن کر بادشاہ کی حالت اچانک بدل گئی اور یہی اس کے لیے دوا بن گئی۔

اس مثنوی میں داستان کا لطف بھی ہے اور شاعرانہ تخیل بھی۔ بیان میں روانی بھی ہے اور اختصار بھی۔ قصے کے اعتبار سے اس مثنوی کو اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

قائم کی ایک اور طویل مثنوی قصہ شاہ لدھا مسمی بہ عشق درویش قابل ذکر ہے۔

قصہ شاہ لدھا مسمی بہ عشق درویش:

اس مثنوی میں قائم نے مثنوی کی ہیئت کے مطابق تعریف عشق، حمد، نعت ومناجات کے بعد آغاز داستان کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ ایک مرد درویش پنجاب میں اپنے تکیے میں رہتا تھا۔ یہ تکیہ ایک پرفضا مقام کے سرے پر واقع تھا جب بھی کوئی مسافر اس راستے سے گزرتا تو وہاں ٹھہرتا اور درویش اس کی خدمت کرتا۔ ایک دفعہ ایک برات وہاں سے گزری اور ٹھنڈی جگہ دیکھ کر وہاں ٹھہر گئی۔ دلہن بھی ڈولی کی گرمی کی شدت سے تنگ آ کر باہر نکلی جس کی وجہ سے درویش اور دلہن میں آنکھیں دوچار ہوگئیں اور ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ جب دھوپ کی شدت کم ہوئی تو برات وہاں سے روانہ ہوگئی۔ درویش کی حالت جاتی ہوئی برات کو دیکھ کر ایک باز وٹوٹے ہوئے پرندے کی طرح ہوگئی۔ جب برات دور چلی گئی تو وہ پیڑ پر چڑھ گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ جب برات نظروں سے اوجھل ہوگئی تو درویش پیڑ پر سے زمین پر گرا اور مر گیا۔ لوگوں کے مشورے پر درویش کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ ادھر جب دلہن گھر پہنچی تو اہل خاندان خوشیاں منا رہے تھے لیکن دلہن زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کا علاج کیا گیا لیکن جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو طے کیا کہ اس کو گھر واپس بھیج دیا جائے۔ بوڑھی کنیز کے ساتھ جب دلہن سسرال سے مائیکے کے لیے روانہ ہوئی تو راستے میں تکیہ پڑا اور وہ یہاں ٹھہر گئی۔ جب دلہن درویش کے تکیہ کی طرف گئی تو دیکھا کہ وہاں درویش کے بجائے اس کی قبر ہے۔ یہ دیکھ کے اس کی حالت خراب ہوگئی اور وہیں گر پڑی۔ اتنے میں قبر شق ہوئی اور دلہن اس میں سما گئی۔ سمانے کے بعد قبر فورا برابر ہوگئی۔

لوگوں نے جب قبر کھود کر دیکھی تو دونوں بغل گیر تھے اور ایک ہو گئے تھے:

اگر چہ دو تھے یوں ظاہر میں وہ ایک
مشابہ یہ کہ ہیں دونوں گویا ایک

نہ کر سکتا تھا فرق ان میں کوئی فرد
کہ ہے زن کون سی اور کون ہے مرد

اس کے بعد قائم نے تنبیہ کے عنوان سے اس میں بارہ اشعار لکھے ہیں اور بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب ساز عشق وحدت آہنگ ہو تو عاشق و معشوق ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں درختم سخن کی سرخی باندھی ہے اور اس میں بتایا ہے کہ انہوں نے اپنا دماغ اور خون دل جلا کر کئی ہفتوں میں یہ قصہ نظم کیا ہے۔ قائم کی یہ دونوں مثنویاں قصہ کے اعتبار سے دلچسپ اور اس دور کے حساب سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ دونوں مثنویاں اردو مثنوی کی روایت کو آگے بڑھتی اور اسے مقبول بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

قائم نے رباعیات وقطعات بھی لکھے ہیں اور اس صنف سخن میں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار بخوبی کیا ہے۔ کچھ رباعیوں میں اپنے ذاتی حالات پر روشنی ڈالی ہے تو کچھ میں اخلاق کو موضوع بنایا ہے۔ بہت سے قطعات و رباعیات مدحیہ ودعائیہ نوعیت کے ہیں اور بعض سے تاریخیں نکالی ہیں۔ ماحصل قائم اس صنف سخن میں بھی دیگر اصناف سخن کی طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

****

حوالہ جات

1۔ مخزن نکات از قائم چاند پوری، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985، ص 85

2۔ مخزن نکات از قائم چاند پوری، مرتب ڈاکٹر اقتداء حسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1966، ص 15

3۔ ایضاً، ص 200

4۔ ایضاً، 46، 47

5۔ کلیات قائم از قائم چاند پوری، مرتب ڈاکٹر اقتداء حسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1965، ص 41

6۔ تذکرہ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985، ص 187

7۔ نکات الشعراء از میر تقی میر، مرتب مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (پاکستان) طبع ثانی 1979، ص 115

8۔ کلیات قائم از قائم چاند پوری، مرتب ڈاکٹر اقتداء حسن، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1965، ص 17، 18

9۔ تذکرہ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985، ص 187

***

رفعتؔ

رفعتؔ کا نام غلام جیلانی اور تخلص پہلے بیدمؔ بعد میں رفعتؔ کر لیا تھا جیسا کہ شوقؔ نے لکھا ہے:

''مولوی غلام جیلانی بیدم تخلص حالا رفعت اختیار نمودہ'' ۱؎

قیام رامپور کے دوران رفعتؔ اور شوقؔ نے اچھا خاصا وقت ساتھ گزارا تھا جس کی وجہ سے ان کے درمیان اچھے تعلقات قائم تھے اور شوقؔ نے رفعتؔ کو طبقات الشعراء میں لفظ یار کہہ کر پکارا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوقؔ اور رفعتؔ کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ اسی وجہ سے شوقؔ کو رفعتؔ کے پہلے تخلص اور ان کے ذاتی حالات کی بھی کچھ حد تک معلومات تھی۔

رفعتؔ کی پیدائش کب ہوئی اس حوالہ سے کسی بھی تذکرہ نگار یا خود رفعتؔ نے کہیں ذکر نہیں کیا کہ ان کی پیدائش کس تاریخ یا سنہ میں ہوئی۔ البتہ ان کی سنہ وفات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی ہوگی۔ رفعتؔ کا انتقال دوشنبہ ستائیس ذوالحجہ کو 1234ھ مطابق 1820ء میں ہوا۔ اور انتقال کے وقت رفعتؔ کی عمر اسی سال تھی جیسا کہ امیر مینائیؔ نے لکھا ہے:

''اسی برس کی عمر مولوی صاحب نے پائی اور بارہ سو چونتیس ہجری میں دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ماہ ذوالحجہ کی ستائیسویں کو رحلت فرمائی'' ۲؎

اب جبکہ رفعتؔ کی عمر انتقال کے وقت اسی سال تھی تو اس حساب سے ان کی پیدائش 1154ھ مطابق 1741ء میں ہوئی ہوگی۔

رفعتؔ پیلی بھیت کے رہنے والے اور مولوی احمد خان شاہجہاں پوری کے نواسہ تھے۔ شوق لکھتے ہیں کہ:

''متوطن پیلی بھیت نبیسہ مولوی احمد خاں شاہجہاں پوری قوم افغان۔'' ۳؎

روہیل کھنڈ پر جب نواب شجاع الدولہ نے قبضہ کیا تو رفعتؔ پیلی بھیت سے آ کر رامپور کے محلّہ رجدوارہ میں رہنے لگے تھے۔ اسی محلّہ میں شرف الدین ولایتی عبد العلی خاں ریاضی داں کے دادا رہتے تھے ان کی لڑکی سے شادی کی جن سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ جن میں سے ایک مولوی غلام حضرت اور دوسری مولوی حیدر علی ٹونکی کو منسوب ہوئی۔

رفعتؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جید عالم اور بے مثل استاد تھے اور رامپور کے بنیادی فنکاروں میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ امیر مینائیؔ رفعتؔ کے علم و فضل اور بزرگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''خلاق مضامین و معانی مولوی غلام جیلانی، عالم باعمل معقول و منقول میں ضرب المثل، جواہر اسرار و حقائق کے سر آمد، ارباب کشف و اصحاب باطن۔'' ۴؎

رفعتؔ نے علوم عقلیہ کی تعلیم مولوی حسن صاحب سے حاصل کی اس کے بعد شاہجہاں آباد گئے اور وہاں شاہ عبد العزیز سے علوم نقلیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور وہیں ایرانیوں سے فارسی میں ملکہ حاصل کرنے کے لیے ان سے فارسی زبان کی کتابیں پڑھیں اور اس میں مہارت تامہ حاصل کی۔ رفعتؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے اور قوت حافظہ اتنا مضبوط تھا کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اکثر شعرا حضرات کی غزلیں اول سے آخر تک زبانی سنا دیتے تھے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

''قوت حافظہ کی یہ کیفیت سنی گئی کہ بعد اتمام صحبت مشاعرہ اکثر شعرا کی غزلیں مطلع سے مقطع تک پڑھ دیتے تھے۔ مولوی عبد العلی صاحب کبیر خاں تسلیم کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ایک دن مولوی صاحب نے فرمایا کہ بیس ہزار دیوان میری نظر سے گزرے ہیں اور ان دواویں کے اشعار جن پر بنظر انتخاب میری صاد ہیں میری بیاض پر مرقوم اور مجھے یاد ہیں۔'' ۵؎

رفعتؔ نے اپنے علم و فضل سے بہت سارے لوگوں کو فیض یاب کیا اسی وجہ سے ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے جن میں سے کچھ اپنے وقت کے جید عالم اور اساتذہ شعرا بن کر چمکے اور اردو شاعری کی راہوں کو ہموار کیا۔ ان کے شاگردوں میں مولوی حیدر علی خاں، مولوی خلیل الرحمٰن، مولوی محمد، مفتی شرف الدین، کبیر خاں تسلیمؔ، عنبر شاہ عنبرؔ، مولوی غیاث الدین عزتؔ اور مولوی احمد علی عباسی چڑیا کوٹی وغیرہ ہیں۔

رفعت نے اسی سال کی عمر پا کر 1234ھ مطابق 1820ء میں رامپور میں انتقال کیا اور ملا غیرت کی مسجد میں دفن ہوئے اور تاریخ قطعہ وفات عنبر شاہ خان عنبرؔ نے کہی جو اس طرح ہے:

چو از دنیا جناب پاک رفعت

گذشت از غم دلم اندوہگیں شد
نہ تنہا جانم از مرگش طپان است
کہ جان عالم از فوتش حزیں شد
زباں در سوگ او پیوست باہم
جہاں در ماتمش با غم قریں شد
وجود پاک او از نیک ذاتے
جنان را بسکہ ہر دم دل نشیں شد
ازاں بہر حساب سال فوتش
بتاریخش دل خلد بریں شد

ان کی قبر پر اکثر حاجت مند آتے ہیں اور پھول وغیرہ چڑھاتے ہیں۔ رفعتؔ کی بزرگی کے متعلق محلّہ کے بزرگوں کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ رفعتؔ کو پہلے موضع کھبر یا سے متصل قبرستان میں دفن کیا گیا تھا جہاں اکثر شہر کے لوگ دفن ہوا کرتے تھے لیکن جب کوسی ندی میں سیلاب آیا تو تمام قبریں اس میں سما گئیں۔ ایک رات رفعتؔ محلّہ کے کسی صاحب کے خواب میں تشریف لائے اور کہا کہ میری قبر کو بچایا جائے۔ دوسری رات ان صاحب نے پھر یہی خواب دیکھا تو لوگ ندی کے کنارے ان کی قبر کو تلاش کرتے ہوئے چلے۔ انہوں نے دیکھا کہ واقعی سیلاب آنے کی وجہ سے ندی ان کی قبر کی زمین کو کاٹ رہی ہے۔ چنانچہ علماء کے مشورے سے ان کی قبر کو کھود کر لاش کو نکالا گیا تو ان کی لاش اور کفن ویسے کے ویسے ہی تھے۔ اس کرامت کے باعث ہی عقیدت مند لوگ ان کی قبر پر پھول چڑھاتے اور منت مانگتے ہیں۔

الغرض لاش کو نکالنے کے بعد ان کو ملا غیرت کی مسجد میں لاکر دفن کر دیا گیا۔ اسی وجہ یہ مسجد مولوی صاحب کے نام سے مشہور ہوگئی۔ جیسا کہ احمد علی شوقؔ نے لکھا ہے:

"زبانی روایت ہے کہ زمانہ سابق میں اہل شہر کا مدفن متصل موضع کھبر یا تھا۔ وہیں مولوی صاحب دفن ہوئے جب دریا میں سیلاب آیا اور قبریں دریا برد ہوگئیں تو مولوی غلام حضرت صاحب اور مولوی رفیع الدین خاں صاحب نے قبر کھود کر نعش نکالی اور مسجد میں لاکر دفن کیا۔"

؎٦

تصانیف:

مولوی صاحب کی متعدد تصنیفات ہیں۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

''تالیفات ان کی کثیر ہیں ان میں سے ایک مثنوی مسمی بہ درمنظوم کہ وہ جنگ نامہ جناب غفران مآب حضرت نواب غلام محمد خاں صاحب بہادر انار اللہ برہانہ کا ہے اور ایک دیوان فارسی اور چند ورق گداختہ متفرق الیہ کے ہیچ میرز کو ہاتھ آئے۔'' ۷

1۔ دیوان ہشت خلد فارسی:

اس میں مختلف شعرا کے اشعار، حمد و نعت، شوقیہ اشعار جن میں معشوق کے سراپے کو موضوع بنایا گیا ہے اور احوال عاشق وغیرہ کو جمع کیا گیا ہے۔

اس دیوان کی ترتیب ضیاء الدین عبرتؔ نے شروع کی تھی لیکن ان کے انتقال ہونے کی وجہ سے ان کے بعد محمد کبیر خاں تسلیمؔ، کرامت علی، شجاعت علی، عنبر شاہ عنبرؔ اور ہمت خاں ہمتؔ وغیرہ نے اس کام کا ذمہ لیا اور غلام مصطفیٰ خاں بہادر معروف بہ نجو خاں کے حکم سے اس کی ترتیب کا کام شروع کیا لیکن نجو خاں جنگ دوجوڑہ میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد سنو خاں بہادر نے جو کہ نواب غلام محمد خاں بہادر کے برادر خرد تھے اس دیوان کی ترتیب کا کام پھر سے شروع کرایا اس طرح اس دیوان کی ترتیب 1210ھ میں مکمل ہوئی۔ 380 صفحات پر مشتمل یہ دیوان رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

2۔ درمنظوم المعروف جنگ دوجوڑہ یا نواب نجو خاں کی جنگ:

اس مثنوی میں جنگ دوجوڑہ جو 1794ء میں نواب غلام محمد خان اور آصف الدولہ کے درمیان دوجوڑہ کے علاقہ میں واقع ہوئی تھی کے واقعات کو شاہنامہ کے انداز میں بڑی خوبی سے نظم کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس مثنوی میں نواب فیض اللہ خان سے لے کر نواب غلام محمد خان تک کے تاریخی واقعات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

یہ مثنوی 1213ھ مطابق 1799ء میں مکمل ہوئی اور تقریباً 3500 ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کو مولوی سید احمد خاں نبیسہ رفعتؔ نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر 1868ء میں نقل کیا تھا۔ اس مثنوی کا نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ جیسا کہ احمد علی خاں شوقؔ لکھتے ہیں:

''اس کا نسخہ جناب نواب سید کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں نے معرفت حکیم علی حسین خاں لکھنوی سید احمد خاں ولد مولوی غلام حضرت خاں مصنف کے نواسے سے ۱۸۶۸ء میں خرید کیا۔ جو ریاست کے کتب خانہ میں موجود ہے۔'' ۸

3۔ مجموعہ رفعت:

اس کے مکمل ہونے کی تاریخ بیاض دلکشا سے نکالی گئی ہے جس کے اعداد 1168ھ بیٹھتے ہیں۔ میاں سلطان شاہ بزودی کا رقم کیا ہوا نسخہ جس کو انہوں نے 1230ھ مطابق 1816ء میں رقم کیا تھا رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

رفعتؔ ایک جید عالم، بے مثل استاد اور عمدہ شاعر تھے اس عہد میں فارسی رواں تھی لہٰذا دیگر کچھ شعرائے روہیل کھنڈ کی طرح رفعتؔ کے یہاں بھی فارسی اشعار کافی پائے جاتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کا اردو کلام نہ کے برابر ہو بلکہ انھوں نے بھی دیگر شعرائے روہیل کھنڈ کی طرح بکثرت اردو کلام چھوڑا ہے۔ مجموعہ رفعت کا اکثر حصہ ان کے اردو کلام پر ہی منحصر ہے۔

رفعتؔ اپنے دور میں ممتاز شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے ان کا زور بیان عام وخاص میں مشہور ومقبول تھا۔ ان کے یہاں زبان شیریں اور صاف، نزاکت معنیٰ، معاملہ بندی اور بے تکلفانہ انداز بیان کے پہلو جا بجا نظر آتے ہیں۔ مزاج میں شگفتگی ہونے کے سبب سلسلہ گفتگو بھی سلیس وصاف تھا نشست قافیہ وبندش الفاظ پر مہارت رکھتے تھے۔ رفعتؔ کی غزل گوئی بے جا پیچیدہ کاری ودقت پسندی سے پاک وصاف اور شستہ وشگفتہ نظر آتی ہے ان کے اشعار کسی کھلتے ہوئے پھول کی طرح ہیں رفعتؔ مشکل مفاہیم کو بہ آسانی ادا کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

رفعت فراق غم بار یہ
اتنا تھا کہ جس کو سہ گئے ہم

کچھ نہیں ہم میں بغیر از دل سوزاں رفعت
پیرہن صورت فانوس نظر آتا ہے

گو اب ہزار شیخ نے ہم سے بنائی بات
پر روبرو بتاں کے نہ ہرگز بن آئی بات
سنگ گراں کسی نے اٹھایا تو کیا ہوا
زور آور اس کا نام ہے جس نے اٹھائی بات

ٹالتا ہے وصل کے وعدوں پہ وہ برسوں مجھے
روز بتلاتا ہے ظالم آج، کل پرسوں مجھے

ان کے فکروفن کی جھلکیاں مختلف اشعار کے پیرائے میں پیش کی جاتی ہیں۔

سلاست وسادگی:

فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو عام فہم اور سادہ لب ولہجہ میں پیش کرنا سادگی کہلاتا ہے۔ان کے یہاں اس وصف سے متصف اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔چنداشعار دیکھیے:

ہوں میں وہ مرغ چمن بعد اسیری جس کو
بال و پر توڑکے کرتا نہیں صیاد پسند

مدت ہوئی کہ نالہ سوزاں نہیں سنا
کوچے سے تیرے حضرت رفعت کدھر گئے

محبوب کی ادا وحسن ادا کا اظہار:

اس افغاں کی کاکل ہمدم شب سر پہ مرے یہ بلا لائی
میں نالہ و افغاں صبح سے لے غم میں جس کے تا شام کیا

جس ادا سے ہے اس جواں کی ادا
کون رکھتا ہے ایسی بانکی ادا
پند ناصح نہ کر کہ اب پتھر
دل ہوا دیکھ ان بتاں کی ادا

گو اب ہزار شیخ نے ہم سے بنائی بات

پر روبرو بتاں کے نہ ہرگز بن آئی بات

جس سنگ دل پہ اپنی یاں ان دنوں نظر ہے
تصویر اس کی دل پر یاں نقش کالجحر ہے

رفعتؔ کے یہاں جذبوں کی امنگ، حوصلوں کی جوانی، فکر مندی، سوز دروں، کرب و بے کسی، تصوف، حقیقت و واقعیت، فطرت پسندی، ہجر و غم، معاملہ بندی اور دیگر کیفیتوں سے لبریز مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی فکر سخن کو طرح طرح سے بروئے کار لاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں عشق مجازی سے متعلق چند اشعار ملاحظہ کریں:

اس دل کو نہ دینا تھا اس کو یہ میں کیا کام کیا
اب لیکے جو اس کافر نے یہاں ناحق مجھ کو بدنام کیا

جور بتاں سے کوئی رہ نہیں سکتا ہے یاں
جانے خدا کس طرف حضرت بیدم گئے

کیوں چاک جگر نہ جوں کتاں ہوں
میں عاشق زار مہوشاں ہوں
ظالم مری بات کا جواب آہ
کچھ اور نہیں سوائے ہاں ہوں

سمجھے جو کوئی محرم اسرار عیب ہو
تیرے دہان تنگ کی میں نے نہ پائی بات

عالم نے دیکھ سوز دل اور چشم تر مری
سو سو طرح کی اس سے لگائی بجھائی کی

ٹالتا ہے وصل کے وعدوں پہ وہ برسوں مجھے
روز بتلاتا ہے ظالم آج کل پرسوں مجھے

کب منفعت کسی کو خوش قامتوں سے پہنچے
گلشن میں سرو کیسا دیکھو تو بے ثمر ہے
خیال زلف و رخ میں نت مری اوقات کٹتی ہے
اسی میں دن گزرتا ہے اسی میں رات کٹتی ہے

کیا کیجیے جو عشق سے اپنا بدن جلے
کیونکر کوئی بجھائے جو آتش سے بن جلے

رفعتؔ کے یہاں ذکر مہوشاں کثرت سے ملتا ہے لیکن رفعت نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سخن کیا ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رفعتؔ کا عام رنگ سخن عشق ہی تھا جس میں عشق حقیقی بھی پایا جاتا ہے۔ رفعتؔ اپنے عہد کے ان ممتاز شعرا میں سے ایک تھے جو فکر کے ساتھ ساتھ علم و فن میں بھی عظیم حیثیت رکھتے تھے۔

****

حوالہ جات

1۔طبقات الشعراءازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)طبع اول1968،ص502

2۔انتخاب یادگارازامیر مینائی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)پہلا اکادمی ایڈیشن1982،ص152

3۔طبقات الشعراءازقدرت اللہ شوق،مرتب نثاراحمد فاروقی،مجلس ترقی ادب(لاہور)طبع اول1968،ص502

4۔انتخاب یادگارازامیر مینائی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)پہلا اکادمی ایڈیشن1982،ص151

5۔ایضاً،152

6۔تذکرہ کاملان رامپورازاحمد علی خاں شوق،لبرٹی آرٹس پریس(مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس)دریا گنج نئی دہلی طبع ثانی 1986،ص286

7۔ انتخاب یادگارازامیر مینائی،اترپردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)پہلا اکادمی ایڈیشن1982،ص151

8۔تذکرہ کاملان رامپورازاحمد علی خاں شوق،لبرٹی آرٹس پریس(مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس)دریا گنج نئی دہلی طبع ثانی 1986،ص284

***

شوقؔ

شوقؔ کا نام قدرت اللہ اور تخلص شوقؔ تھا۔ شوق موضع موئی، تحصیل بہیڑی، ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں پہلے علاقہ روہیل کھنڈ سرکار سنبھل کے ماتحت تھا۔ جب حافظ رحمت خاں کا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو یہ گاؤں ضلع بریلی میں شامل کر دیا گیا۔ امیر مینائی نے موضع موئی کو مضافات سنبھل میں شامل لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولوی قدرت اللہ شوق ابن قبول محمد قصبہ موئی مضافات سنبھل کے متوطن شیخ کرم اللہ شہید مغفور کی اولاد میں بڑے نیک باطن'' [۱]

جس کی وجہ سے بہت سارے افراد غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور شوق کو سنبھلی سمجھنے لگے۔ دراصل سنبھل مغلیہ دور میں صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا جس کے تحت مراد آباد، رامپور بریلی وغیرہ آتے تھے۔ اور موضع موئی اس وقت سرکار رامپور میں شامل تھا۔ اس وجہ سے امیر مینائی نے اس کو مضافات سنبھل لکھ دیا۔ لیکن جب حافظ رحمت خاں کا علاقہ انگریزوں کے ماتحت ہوا تو موضع موئی کو ضلع بریلی میں شامل کر دیا گیا۔

شوق کے والد کا نام شیخ قبول محمد اور جد اعلیٰ کا نام شیخ کرم اللہ تھا۔ شوق نے ابتدائی تعلیم موئی میں ہی حاصل کی۔ جب سن شعور کو پہنچے تو رامپور چلے گئے اور وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شوق نے اپنے ایک استاد مولوی غلام طیب بہاری کا ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے کچھ کتابیں پڑھیں تھیں۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

''تاریخ جام جہاں نما سے معلوم ہوا ہے کہ علوم درسیہ مولوی غلام طیب ساکن صوبہ بہار سے حاصل کی۔'' [۲]

ان کے علاوہ کسی اور استاد کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ شاعری میں کس کے شاگرد تھے۔ البتہ امیر مینائی، سعادت خان ناصر، لالہ سری رام وغیرہ نے انہیں قائم کا شاگرد بتایا ہے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

''تذکرہ سعادت خان ناصر اور تذکرہ گلشن بے خار مولفہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے دریافت
ہوا کہ فن شعر میں قائم چاند پوری تلمیذ مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے'' ۳؎

جب اس حوالہ کو چیک کیا گیا تو پتہ چلا کہ گلشن بے خار میں شیفتہ نے کوئی ایسی عبارت ہی نہیں لکھی۔ البتہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں سعادت خان ناصر کی عبارت ضرور ملتی ہے۔ سعادت خان ناصؔر لکھتے ہیں:

''ملائے زماں، فاضل دوراں، شاعر باذوق، مولوی قدرت اللہ متخلص بہ شوق، ساکن رامپور،
شاگرد قائم۔'' ۴؎

لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''علوم درسیہ کی تکمیل مولوی غلام طیب ساکن صوبہ بہار سے کی اور فن شعر میں مولوی قیام
الدین قائم چاند پوری سے تلمذ تھا'' ۵؎

اب یہ بات یقین مستحکم کے ساتھ تو نہیں کہی جا سکتی کہ شوؔق نے قائؔم سے تلمذ حاصل کیا تھا یا نہیں کیوں کہ شوؔق نے خود اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ تلمذ حاصل کیا ہوگا کیوں کہ قائؔم جب آنولہ میں تھے تو شوؔق نے آنولہ کا سفر کیا تھا اور جب قائؔم رامپور آئے تو شوؔق کی ان سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ اور شوؔق قائؔم سے عمر میں بھی کافی چھوٹے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ روہیل کھنڈ میں قائؔم جیسا استاد موجود ہو اور اس کے ساتھ ملاقاتیں بھی رہی ہوں لیکن شاگردی اختیار نہ کی ہو؟۔

شوق اپنے وقت کے ایک جلیل القدر استاد مانے جاتے تھے۔ علاقہ روہیل کھنڈ میں قائؔم کے انتقال کے بعد اگر اس وقت استادی میں کسی کا نام آتا تھا تو وہ شوؔق کا ہی تھا۔ اسی وجہ سے شوؔق کے حلقہ تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔

مصحؔفی لکھتے ہیں: ''اکثر مردم آں نواح بہ حلقہ شاگردیش درآمدند'' ۶؎

شیفؔتہ لکھتے ہیں: ''در جرگہ فضلاء ثبت است'' ۷؎

شوق کے تلامذہ کی تعداد نثار احمد فاروقی نے 13 بتائی ہے جن کا مختلف ذرائع سے پتہ چلا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے تلامذہ تھے جن کا شمار آگے چل کر اپنے وقت کے مستند اساتذہ میں ہوا۔ تلامذہ کے حوالہ سے نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''مختلف ذرائع سے شوق کے مندرجہ ذیل تلامذہ کا حال معلوم ہوتا ہے'' ۸؎

تلامذہ:

اخون زادہ احمد خاں غفلؔت، حکیم احمد خاں فاخؔر، الہ داد عرف شبراتی طالؔب، غلام قادر مسکیؔن، غلام محمد خاں ماہؔر،

عنبر شاہ خان آشفتہ، احمد خاں احمد، شیخ غلام علی حرفت، ناصر خاں ناصر، مستقیم خاں وسعت، میر محبّ علی مفلس، شیخ کریم الدین صنعت، کریم اللہ خاں کرم۔

شوق کے احباب کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔انھوں نے اپنے تذکرے طبقات الشعراء میں اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔حتی کہ طبقہ چہارم کا چوتھا اور پانچواں مقالہ خاص کر انہیں شعرا حضرات پر مشتمل ہے جن کے ساتھ شوق کی دوستی یا گہرے تعلقات تھے۔ان دونوں مقالوں میں شوق نے 96 شعرا کا ذکر کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شوق اپنے وقت کی ایک معروف شخصیت تھے۔اسی وجہ سے شوق کے شعرا حضرات کے ایک بڑے حلقہ کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔

شوق کی پیدائش کب ہوئی اس حوالہ سے تو کوئی سراغ یا اشارہ نہیں ملتا البتہ وفات کے متعلق قطعہ تاریخ وفات ضرور ملتا ہے۔جس کو حکیم احمد خاں فاخر نے لکھا ہے جو کہ انتخاب یادگار میں موجود ہے۔اس قطعہ کے حساب سے شوق کی تاریخ وفات 1224ھ مطابق 1810ء نکلتی ہے۔امیر مینائی لکھتے ہیں:

''بارہ سو چوبیس ہجری میں قضاء کی حکیم احمد خاں فاخر نے تاریخ وفات کہی ہے۔وہ یہاں لکھی جاتی ہے۔'' 9

سفر کرد از جہاں چوں حضرت شوق
بر آورد از زباں ہر یک بشر ہائے
دلم تاریخ گفت از روے افسوس
سراج شاعری از بزم شد وائے

تاریخ پیدائش کی طرح شوق کا مدفن کہاں ہے اس بارے میں بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔لیکن جس طرح شوق نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ رامپور میں ہی گزارا اور آخری عمر میں ان کا کسی اور جگہ سفر کرنا اس حوالہ سے بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا تو قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا انتقال رامپور میں ہی ہوا ہوگا اور وہیں دفن ہوئے ہونگے۔

تصانیف:

شوق کی چار تصانیف ہیں۔طبقات الشعراء، تاریخ جام جہاں نما، تکملۃ الشعراء جام جمشید اور دیوان اردو۔

1۔طبقات الشعراء:

یہ تذکرہ شوق کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔شوق نے یہ تذکرہ لکھ کر تاریخ ادب اردو میں

ہمیشہ کے لیے اپنے نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ فن تذکرہ نگاری میں کئی وجھوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس تذکرے کی خصوصیات میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس کے بیشتر ہم عصر شعرا کے کلام کا انتخاب خود ان شعرا کے مسودات سے کیا گیا ہے۔ اور اس کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ اس کے اکثر شعرا شوقؔ کے ہم عصر اور علاقہ روہیل کھنڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں روہیل کھنڈ کے علمی و ادبی ماحول کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ شوق نے یہ تذکرہ 1188ھ مطابق 1774ء میں مکمل کیا لیکن 1209ھ مطابق 1794ء تک اس میں کچھ اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ جیسا کہ اس تذکرہ کی تاریخ تصنیف کے حوالہ سے بحث کرنے کے بعد نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''شوق نے پہلی مرتبہ 1188ھ میں اپنا تذکرہ لکھا پھر 1209ھ میں اس میں معتد بہ اضافہ کیا۔'' [10]

یہ تذکرہ چار طبقات پر منقسم ہے جس میں چوتھا طبقہ پانچ مقالات پر مشتمل ہے۔

طبقہ اول: (در بیان ایجاد شعر ریختہ و ذکر شعرائے دکھنی و بعضے معاصر آنہا)۔ اس طبقہ کے تحت شوق نے اکیس شعرا کا ذکر کیا ہے۔

طبقہ دوم: (در ذکر شاعران ایہام گو)۔ اس طبقہ کے تحت بھی اکیس شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔

طبقہ سوم: (در ذکر شعرائے متاخرین و بعضے نو مشقان دیگر)۔ اس طبقہ کے تحت شوق نے اکیاون 51 شعرا کا ذکر کیا ہے۔

طبقہ چہارم: (در ذکر شعرائے تازہ گو و بعضے نو مشقان دیگر)۔ اس طبقہ کو شوق نے پانچ مقالات میں منقسم کیا ہے۔ اور ان مقالات میں اکثر ان شعرا کو شامل کیا ہے جو انہیں کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ جن میں سے کچھ شوق کے تعلقاتی، کچھ دوست و احباب، کچھ رشتہ دار اور سلاطین و نوابین وغیرہ تھے۔

مقالہ اول: (در ذکر بعضے تازہ گویان سر آمد روزگار)۔ اس مقالہ کے تحت شوق نے اٹھاون 58 شعرا کا ذکر کیا ہے۔

مقالہ دوم: (در ذکر بعضے سلاطین روزگار و وزرائے نام دار و امرائے والا تبار و بعضے منصب داران سرکار فیض آثار و مصاحبان شاہزادہ عالی مقدار)۔ اس کے تحت بیس 20 شعرا کو شامل کیا ہے۔

مقالہ سوم: (در ذکر بعضے امرائے افغانان ایں دیار وغیرہ۔ افاغنہ قرب و جوار)۔ اس مقالہ کے تحت بھی شوق

نے بیس 20 شعرا کو شامل کیا ہے۔

مقالہ چہارم: (درذکر بعضے عزیزان و یاران ہم دم و دوست داران ثابت قدم)۔اس مقالہ میں دس 10 شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقالہ پنجم: (درذکر بعضے برادران وخویشاں و دوست داران و یاران دل ریشان و بعضے نومشقان کہ چندا مایہ شاعری نہ دارند و بہ سبب موزونی طبیعت خود را از خود زیادہ پنداشتہ درجرگہ شعرا میں شمارند)۔اس مقالہ کے تحت شوق نے چھیاسی 86 شعرا کو شامل کیا ہے۔ان کے علاوہ کچھ شعرا کو ضمیمہ کے تحت بھی شامل کیا ہے جن کی تعداد پچیس 25 ہے۔

2۔تاریخ جام جہاں نما:

شوق نے اس میں ہندوستان اور ایران کے سلاطین و اولیاء کے حالات بیان کیے ہیں۔یہ کتاب ایک مقدمہ اور انتالیس 39 طبقات پر منقسم کی گئی ہے۔اس کی تالیف کا آغاز 1191ھ مطابق 1777ء میں ہوا تھا اور غالباً اس کی پہلی روایت 1199ھ مطابق 1785ء میں مکمل ہوئی۔لیکن شوق اس میں آخری دم تک اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

3۔تکملۃ الشعراء جام جمشید:

اس تذکرہ میں فارسی شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔اور اس کو لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ جب شوؔق جام جہاں نما کی تالیف سے فارغ ہوئے تو کچھ دوستوں نے کہا کہ اس میں فارسی شعراء کا تذکرہ نہیں ہے۔لہٰذا شوؔق نے اس کے تکملہ کے طور پر یہ تذکرہ تصنیف کیا۔

اس تذکرہ کی تالیف کا آغاز 1199ھ مطابق 1785ء میں ہوا۔اور اضافوں کا سلسلہ 1213ھ مطابق 1798ء تک جاری رہا۔شوؔق نے اس تذکرہ کو دو مقالوں میں منقسم کیا ہے۔(الف) درذکر شعرائے عرب (ب) درذکر شعرائے عجم۔اس تذکرہ کے رضا لائبریری رامپور میں دو نسخے موجود ہیں۔ایک نسخہ حافظ غلام محی الدین نے صاحبزادہ مظفر علی خاں بہادر کی فرمائش پر 1218ھ مطابق 1803ء میں رامپور میں لکھا۔اور دوسرا نسخہ مصنف کے ذاتی نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔جو 1244ھ مطابق 1835ء میں مکمل ہوا۔

4۔دیوان اردو:

شوؔق نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔جیسا کہ لالہ سری رام نے لکھا ہے:

''کبھی قدرت بھی تخلص کرتے تھے ان کا دیوان مرتب ہو گیا تھا۔1224ھ میں انتقال کیا۔''

۱۱؎

عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں:

''شوقؔ تخلص مولوی قدرت اللہ باشندہ موضع موئی ضلع سنبھل مراد آباد و مقیم رامپور۔ بڑے عالم تھے ان سے دیوان و تذکرہ شعرا یادگار ہیں۔'' ۱۲؎

لیکن یہ دیوان اب دستیاب نہیں ہے۔ شوقؔ نے اپنے کلام کا کچھ انتخاب اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں دیا ہے۔ اس کے علاوہ مصحفیؔ، شیفتہؔ، امیر مینائیؔ اور لالہ سری رام وغیرہ کے تذکروں میں بھی کچھ انتخاب کلام موجود ہے۔

قدرت اللہ شوقؔ ایک صاحب طرز، پختہ سخن اور پرگو شاعر تھے ساتھ ہی اپنے ہم عصروں میں شاعرانہ انفرادیت کے بھی حامل تھے۔ شوقؔ کے اشعار والہانہ پن، وارفتگی اور شرر آشنائی سے دل کو سوزاں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں دیوانگی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے اور روش شاعری عاشقانہ ہے۔ ان کا محبوب عام شعرا کے محبوبوں جیسا ہی ہے لیکن ان کا اظہار عشق و محبت کا انداز ذرا نرالا ہے یہ جذبوں کی سچائی میں غرق ہو کر فکر سخن کرتے ہیں اور دل پر گزری معمولی بات بھی اپنے پورے احساس ادا کے ساتھ بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شوقؔ کے یہاں اشاریت و رمزیت، گہرائی و گیرائی، پرکاری اور دیگر صوفیانہ لہجے بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا اکثر حصہ عشقِ مجازی کی نذر ہے اور یہ کیفیت عشق اور احساس محبت کو الگ الگ طرح سے ظاہر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شوقؔ اپنے فن کی پختہ کاری میں اپنی مثال آپ ہیں خود بقول شوقؔ:

اے شوق ترے شوق کا انداز کیا کہوں
عالم سے تو رکھے ہے زبان علیحدہ

عشق مجازی کے اظہار پر کچھ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

کچھ پوچھ نہ ظالم مرا احوال کہ دل پر
دن رات ترا ذکر ہے اور نام خدا کا

جب تک مری بالیں پہ دلا رام نہ آیا
اس کشتہ الفت کو تو آرام نہ آیا
گر شب کو ملوں اس سے تو ٹالے ہے سحر پر

ہو صبح تو کہتا ہے سر شام نہ آیا

ہر کہیں جان تو نہ جا بے جا
رکھ لحاظ اپنے دل میں جا بے جا
میں جو رخصت طلب ہوا اس سے
بولا جھنجھلا کے وہ کہ جا بے جا

دل زنخداں کی چاہ میں ڈوبا
کیسے بحر اتھاہ میں ڈوبا
ماہ نو رشک سے کس ابرو کے
اچھلے ہے ایک ماہ میں ڈوبا

ہنسی آتی ہے اس کی بات پر مجھ کو کہ کہتا ہے
فلانا روتا رہتا ہے ذرا پوچھو ہے کیا باعث

کیا ہے بعد مدت میں سوال آج
نہ کر بوسے سے پیارے ٹال بال آج
کیا زخمی مجھے تیر نگہ سے
صریحاً جان بوجھ اور دیکھ بھال آج

سن آہ و فغاں میری کو کھاکر وہ جواں درد
پوچھے تھا مجھے آن کے ہوتا ہے کہاں درد

آتا ہے جب پہن کے وہ گل پیرہن لباس
پھاڑیں ہیں اپنا رشک سے اہل چمن لباس

اس کو نہیں ہے قول کا میرے ٹک اعتبار
پہنچے ہے بات بات پہ نوبت قسم تلک
ہے تس پہ یہ غضب کہ نہیں مانتا وہ شوخ
لے جاؤں کاش ہاتھ بھی اس کے قدم تلک
اے شوق تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم
سودا و میر و قائم و درد و الم تلک

شوقؔ نے اپنے محبوب کی دلفریب اداؤں کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔محبوب کے حسن کی عکاسی، پیکر تراشی، شیریں گفتاری، غمزہ وعشوہ گری اور ناز ونخرے کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے خیال کا محور سراپائے محبوب ہے ہاں کبھی کبھی طبیعت کا میلان جداگانہ بھی نظر آتا ہے۔ان کے یہاں دبستانِ دہلی کی داخلیت، دردو کرب اور حزن و یاس جیسے مضامین بھی پائے جاتے ہیں چند مثالیں دیکھیے :

زمین و آسماں سب دشت اور کہسار لے ڈوبی
اک عالم اشک کے طوفاں میں چشم زار لے ڈوبی

غافل مجھے گھڑیال یہ کرتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

آہ اک دم نہ رہی صحبت یاراں باقی
رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

شمع مزار کچھ نہیں درکار ہے مجھے

جلتے ہیں دل غریبوں کے مجھ پر بجائے شمع
شبنم کی طرح ہستی موہوم گل پہ رو
یک شب کی زندگی پہ یہ سر مت اٹھائے شمع

بس کہ دل تنگ ہوں میں عالم سے
اب جہاں سیتی دل اٹھایئے گا

قدرت اللہ شوقؔ کو فکر و فن کا استاد کہا جا سکتا ہے۔انھوں نے اپنے رنگ سخن کو پختہ رکھا جس کی وجہ سے بعد کے کثیر شعرا بھی انہیں کی طرز پر شعر گوئی کرتے ہوئے نظر آئے۔شوقؔ کی شاعری کیفیت دل اور احساس محبت کو بیان کرنے میں انفرادی نوعیت رکھتی تھی ان کے سخن کا بنیادی رنگ عشق مجازی تھا جو قسم قسم کے گلوں کے ساتھ ابھرتا تھا۔اگر چہ انھوں نے دیگر معاملات سخن کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔

****

حوالہ جات

1۔انتخاب یادگار ازامیر مینائی،اترپردیش اردواکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 183

2۔ایضًا،ص 183

3۔ایضًا،ص 183

4۔تذکرہ خوش معرکہ زیبا ازسعادت خاں ناصر،مرتب مشفق خواجہ،مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1970،ص 30

5۔خم خانہ جاوید (جلد پنجم) از لالہ سری رام،مرتب برج موہن دا تا تریہ کیفی،ص 82

6۔ریاض الفصحا ازغلام ہمدانی مصحفی،اترپردیش اردواکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985،ص 164

7۔گلشن بے خار ازمصطفیٰ خان شیفتہ،اترپردیش اردواکیڈمی (لکھنؤ)،ص 112

8۔طبقات الشعراء ازقدرت اللہ شوق،مرتب نثار احمد فاروقی،مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1968،ص 30

9۔انتخاب یادگار ازامیر مینائی،اترپردیش اردواکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 183

10۔طبقات الشعراء ازقدرت اللہ شوق،مرتب نثار احمد فاروقی،مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1968،ص 45

11۔خم خانہ جاوید (جلد پنجم) از لالہ سری رام،مرتب برج موہن دا تا تریہ کیفی،ص 82

12۔سخن شعرا ازعبدالغفور نساخ،اترپردیش اردواکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 255

***

نواب محبت خان

حافظ رحمت خاں کی تمام بیویوں سے تیئیس اولاد تھیں جن میں سے چودہ لڑکے تھے۔اوران لڑکوں میں نواب محبت خاں حافظ رحمت خاں کے چوتھے بیٹے اورنواب عنایت خان کے حقیقی بھائی تھے۔

محبت خان کی پیدائش 1750ء میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم حسب رواج درباری علماء کی نگرانی میں حاصل کی۔ محبت خان کی مادری زبان پشتو اور فارسی تھی لیکن اردو جوکہ ایک عوامی زبان تھی لہٰذا اس میں بھی مہارت حاصل تھی اور سنسکرت وعربی میں بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔لہٰذا الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

''حافظ الملک کی یمن توجہات سے علوم عربیہ میں بکثرت علماء سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔فارسی میں استادوں کے استاد تھے، نیز زبان سنسکرت میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ذہن وذکا اور طبع رسا میں عدیم النظیر تھے،اہل استعداد ہمیشہ ان سے اساتذہ متقدمین کا کلام سمجھنے آیا کرتے تھے۔'' [1]

علم وادب میں فضیلت رکھنے کے علاوہ محبت خان کوفنون سپہ گری میں پٹھانوں کی روایت کی مطابق کمال حاصل تھاانہوں نے جنگ روہیلہ 1774ء میں دادشجاعت دی تھی۔ساتھ ہی محبت موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔کئی موسیقاران کی سرکار سے تنخواہیں پاتے تھے۔چنانچہ الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

''نواب محبت خاں فنون سپہ گری کے ماہر تھے،علم موسیقی کا بھی حد درجہ شوق تھا اور لکھنؤ کے بعض گویئے ان کے پاس ملازم تھے'' [2]

حافظ رحمت خاں کی زندگی میں ہی محبت خان کی شادی فرید پور ضلع بریلی میں عبدالستار خاں کمال زائی کی صاحب زادی سے ہوگئی تھی۔اورمدعا شاہجہاں آبادی نے ان کی شادی پر ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا جس کے چند اشعار یہ

ہیں۔

ماہ نے کھول دیا ہے کف سیمیں اپنا
دوسرا ہاتھ جو پایا تو بجایا دستک
حسن کے خلوتیاں بزم حنا بندی میں
شعلے سے باندھیں ہیں پروانہ کے پاؤں پہ کفک
محفل عیش میں بلبل نے بجائی شہنا
گوشہ باغ میں غنچے نے اٹھائی ڈھولک
ساقی شوخ کہے ہے کہ غنیمت ہے وقت
ساغر عمر تو لبریز ہے مت جائے چھلک
شیخ اگر کچھ بھی ہے غیرت کی ترے دل میں ترنگ
ساغر و شیشہ اٹھا سبحہ و سجادہ ٹپک
جشن نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے
جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

محبت نہایت کثیر الاولاد تھے لڑکیوں کے علاوہ اٹھارہ لڑکے چھوڑے جن میں سے ایک یعنی امام بخش خاں نے محبت خاں کی زندگی میں ہی انتقال کیا۔نواب سعادت یار خان ان کے لڑکوں کی تعداد ان کے اسماءگرامی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان سے اٹھارہ لڑکے ہوئے۔اس تفصیل کے ساتھ کہ علی اکبر خاں، امام بخش خاں، حیدر علی خاں، شاہ عالم خاں، منصور خاں، محتشم خاں، شمس الدین خاں، یوسف خاں، مقیم خاں، حافظ خاں، خسرو خاں، مہدی علی خاں، خدا یار خاں، لطف اللہ خاں، شاہ ولی خاں، غیرت خاں، موسیٰ خاں، نسیم خاں۔'' [۳]

1774ء میں جنگ روہیلہ ہوئی جس میں نواب شجاع الدولہ کو فتح حاصل ہوئی اور حافظ رحمت خاں جنگ میں شہید ہوئے۔روہیل کھنڈ کی مرکزی حکومت ختم ہوگئی جس کی وجہ سے روہیلوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔نواب محبت خاں اوران کے خاندان والوں کو قید کرلیا گیا۔چنانچہ الطاف علی بریلوی روہیلوں کے استیصال کا منظر کچھ اس طرح

بیان کرتے ہیں:

''لشکر کے ہمراہ محبت خاں اور ان کے بھائیوں کے علاوہ حافظ الملک مرحوم کی اہلیہ محترمہ، نواب عنایت خاں مرحوم کی بیوہ اور دوسری بیگمات اور بچوں کو بھی شیدی بشیر نے کشاں کشاں سخت بے حرمتی اور رسوائی کے ساتھ پیدل اور بار برداری کے چھکڑوں پر سوار کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔ مئی کا مہینہ جو روہیل کھنڈ میں سخت گرمی اور دھوپ کا زمانہ ہوتا ہے شروع ہو گیا تھا اور ان ناز پروردوں کو بیسیوں کوس چٹیل میدانوں میں اسی دھوپ اور لو میں پیدل یا چھکڑے پر تمام تمام دین سفر کرایا جاتا تھا۔ تمام قیدی ایک دوسرے سے رسیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ جسموں پر میلے کپڑے نہایت کثیف اور بوسیدہ ہو گئے تھے۔ کئی کئی وقت بھوکے پیاسے رکھے جاتے اور کوئی نہ پوچھتا کہ تم نے کیا کھایا اور کیا پیا۔ اگر دوسروں کو کھاتے پیتے دیکھ کر یہ لوگ خود کچھ مانگتے تو لشکر کے وحشی سپاہی ان پر قہقہے لگاتے اور جھڑک کر خاموش کر دیتے'' ۴

اس کے بعد نواب محبت خاں کو ان کے خاندان والوں کے ساتھ قلعہ الہ آباد میں قید کر دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ نے نواب محبت خاں کو ان کی اور ان کے اہل خانہ کی آزادی کی ایک ہزار رپے ماہوار کے ساتھ پیش کش کی جس کو محبت خان نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میرے بچے اور بیوی تو آزاد ہو جائیں لیکن میری والدہ اور دیگر خاندان والے قید و بند کی زندگی بسر کریں یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کے بعد اپنے بھائیوں نواب ذوالفقار خاں اور ارادت خاں جو کہ پہلے سے ہی لشکر کی نگرانی میں تھے، کے پاس چلے گئے اور لشکر میں شامل ہو گئے۔ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد جب آصف الدولہ مسند نشیں ہوئے تو انگریزوں کی مداخلت پر روہیلے قلعے سے آزاد کر کے لکھنؤ لائے گئے جہاں ان کے وظائف مقرر ہوئے۔ اور ان وظائف میں سے نواب محبت خاں کے لیے سترہ ہزار ایک سو ستائیس ر پیہ چند آنے وجہ مقررہ سے اور دس روپیہ یومیہ ریزیڈنٹ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر ہوئے۔ نواب سعادت یار خان محبت خان کے وظیفہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ لوگ سرکار کے مقررہ وظیفے میں سے سترہ ہزار ایک سو ستائیس روپیہ اور چند آنہ سالانہ، اور اس کے علاوہ ریزیڈنٹ لکھنؤ کے خزانہ سے دس روپیہ یومیہ پاتے ہیں، اور حافظ الملک کے علاقہ داروں کا آٹھ ہزار اور چھ سو چالیس روپیہ سالانہ بھی ان میں سے بعض کے تصرف اور اختیار میں ہے۔'' ۵

جب محبت خان اوران کے اہل وعیال نیز خاندان والوں کو رہائی ملی اور ساتھ ہی وظائف مقرر ہوئے تو اس سے ان کے مصائب کا دور ختم ہوا اور فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

محبت خان غزل گو بھی تھے اور مثنوی نگار بھی۔ فارسی، عربی اور پشتو میں بھی کہتے تھے۔ مربی سخن بھی تھے چنانچہ خواجہ حسن، جعفرعلی حسرت اور قلندر بخش جرت ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ محبت خان نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ حسن سے باہمی صلاح کے طور پر مشورہ سخن کیا۔ اس کے بعد جعفرعلی حسرت کی شاگردی اختیار کرلی۔ حسرت کے انتقال کے بعد اپنی فکر کو رہنما بنایا اور شاعری کرتے رہے۔

نواب محبت خاں نے 59 سال کی عمر پا کر 13 صفر 1224ھ مطابق 1809ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وزیر باغ نزد کشور گنج میں دفن ہوئے۔

تصانیف:

1۔ آمدنامہ

2۔ لغت

3۔ عربی، فارسی، پشتو اور اردو شاعری پر مشتمل ایک کلیات

4۔ مثنوی اسرار محبت

جیسا کہ الطاف علی بریلوی محبت خاں کے ادبی کارناموں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''عربی، فارسی، پشتو اور اردو میں بکثرت کلام یادگار چھوڑا، جو ہنگامہ 1857ء میں تلف ہوگیا کہیں کہیں شعراء کے تذکروں میں اس کا پتہ ملتا ہے۔ ان کی ایک مثنوی مثنوی اسرار محبت بہت مشہور تھی۔ فارسی قواعد کا ایک آمدنامہ، اور ایک بہت بڑی لغت بھی ترتیب دی تھی۔'' [۲]

ان میں سے آمدنامہ اب نایاب ہے، لغت کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، کلیات کا ایک خطی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے اور مثنوی اسرار محبت کے چار خطی نسخے اور ایک مطبوعہ نسخہ الگ الگ جگہوں پر محفوظ ہیں۔

1۔ لغت ریاض المحبت:

اس لغت کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ اس کی سن تالیف تو پتہ نہیں البتہ کاتب نے اس کی اتمام نقل کی تاریخ 21 ذوالحجہ 1230ھ مطابق 1 مئی 1814ء تحریر کی ہے۔ اس طرح یہ نسخہ محبت خاں کے انتقال کے

پانچ سال بعد نقل ہوا۔اس نسخہ میں نہ تمہید ہے اور نہ ترقیمہ۔تعداد صفحات 224 ہے۔اس میں پشتو الفاظ کے فارسی معنی بتائے گئے ہیں جن کی تعداد 210 ہے۔ان الفاظ کے معنی بتانے سے پہلے ان کا تلفظ بھی بیان کیا گیا ہے۔اور ساتھ ہی ان الفاظ کو خط نسخ میں جلی قلم سے لکھا گیا ہے اور ان پر سرخ لکیر بھی کھینچی گئی ہے تا کہ معنی سے امتیاز پیدا ہو جائے۔

2۔دیوان غزلیات:

اس دیوان کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔اس کے صفحات کی تعداد دوسوبیس (220) ہے اور ہر صفحہ پر اوسطا دو غزلیں ہیں۔دیوان میں نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ البتہ ابتدائی صفحہ پر ایک نوٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کتب خانہ رامپور میں 9 جون 1906ء کو آیا۔کاغذ قدیم،غزلیں صاف اور خوش خط لکھی گئی ہیں۔

محبت خان جس دور میں شاعری کر رہے تھے اردو زبان ادبی ولسانی اعتبار سے ترقی کے راستوں پر گامزن تھی یعنی یہ اصلاح زبان کا دور تھا،عربی فارسی الفاظ کا اضافہ ہو رہا تھا۔اس وقت تک اردو شاعری میں زبان کی نرماہٹ اور فارسی خیالات والفاظ کے استعمال سے شعر کے اثرات دوآتشہ ہو رہے تھے۔غزل میں خیال کی سادگی،جذبات کی گرمی اور بیان کی اثر انگیزی تھی۔اس کے کچھ سالوں بعد ہی لکھنؤ کے شعرا کے یہاں نامانوس اور مشکل فارسی وعربی الفاظ،تشبیہات واستعارات،مبالغہ آرائی،ژولیدہ خیالی اور رصناعی کی وجہ سے غزل کی روح ختم ہوگئی۔متروک اور غیر متروک فصیح اور غیر فصیح کی بحثوں میں فارسی وعربی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ اصل تحریک غیر فطری بن گئی۔محبت خان کا تعلق اس تحریک کے فطری دور سے تھا۔انہوں نے بھی فارسی سے استفادہ کیا مگر ایک خاص تناسب سے اسی لیے محبت خان کی شاعری خاصی اہم ہو جاتی ہے۔چند اشعار دیکھیے۔

نظر پڑتے ہی تجھ پر مرا گلہ نہ رہا
کہ دیکھتے تجھے دل میں مدعا نہ رہا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہو
تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانہ میں

دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا
اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

گالی کا انتظار تو حد سے گزر چکا
منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

پاک بازی پہ مری شک ہے تو دیتے جاؤ
بوسہ ہر بار مجھے قسم لے لے کر

اب تلک دنیا میں کیا کیا نعمتیں کھاتے رہے
عشق میں اب تیرے غم کو کھایئے یوں ہی سہی

اس سادہ، شگفتہ اور غنائی فضا میں درد کی ٹیسوں، غم کی تپش اور مایوسی ومحرومی کے ماحول کا شبہ تک نہیں ہوتا لیکن اشعار میں محبت خان کی شخصیت کا سونا پگھل کر چھلکتا ہے۔

اس غم کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ذہنی لذت یا کسی مقصد میں ناکامی اور احساس محرومی۔ جب ان کی زندگی کے حالات کی طرف نظر کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دو ایک سال چھوڑ کر عمر کا تمام حصہ عیش وعشرت میں گزرا، شہرت، عزت اور ثروت نے قدم چومے۔ اس لیے بظاہر ان کی زندگی شاد نظر آتی ہے لیکن ان کے کلام کی یاسیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زخم خوردہ تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا
دیدہ بے اختیار بہہ آیا

دل تو ایک مدت ہوئی جاتا رہا سینے سے
بس درد کے پڑھے گا تو اشعار کب تلک

محبت آبلہ پا کو ہوتی ہے اب کے پھر وحشت
یہ مژدہ جا کے پہنچا دو کوئی خار بیاباں کو

کیا کہیں پہچاننے سے آشنا سب رہ گئے
ہم نے دیکھا یاں تلک آزار دل کے ہاتھ سے

اے فلک پیدا کیا تو نے غم میرے لیے
راحت اوروں کے لیے درد و الم میرے لیے

محبت خان کی زندگی کے دو سال 1774 اور 1775 بڑے ہی پر آشوب تھے جو ایک غیور پٹھان اور ایک والی ملک کے اعصاب منتشر کرنے کے لئے کافی تھے۔ جنگ روہیلہ میں ناکامی اور اولوالعزم باپ کی وفات، جنگ کے بعد روہیلوں کا استیصال، اہل خاندان کی کسمپرسی اور بے توقیری ایسے حالات ہیں جو ایک ذہین و ذکی الحس انسان کا نظام فکر بدلنے کے لیے کافی ہیں۔ لکھنؤ میں اقامت اختیار کرنے کے بعد گو انھیں عزت و آرام میسر تو ہوا لیکن زخم مندمل نہ ہو سکے اور غریب الوطنی اور عظمت رفتہ کے احساس سے ان کا دل بڑا غمگین رہا۔ ان کا یہ شعر اسی نوعیت کا ہے:

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم
از خون خود قفس شدہ رشک چمن مرا

اہل طریقیت کی بات زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہے اور شاعری میں اسی کلام میں تاثیر ہوتی ہے جس میں زبان سے زیادہ دل کو دخل ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود شاعر کا دل کسی جذبے سے متاثر ہو۔ محبت خان نے غم جاناں اور غم حیات کو خون دل میں تحلیل کر کے اشعار کہے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں سوز کا اثر پایا جاتا ہے۔

3۔ مثنوی اسرار محبت:

یہ مثنوی بیت السلطنت لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس مثنوی کے چار خطی نسخے بھی ہیں۔ ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ دوسرا سالار جنگ حیدر آباد کے کتب خانہ میں ہے۔ تیسرا نسخہ لاہور یونی ورسٹی میں اور چوتھا انجمن ترقی اردو کراچی کتب خانہ میں موجود ہے۔

یہ مثنوی 1197ھ مطابق 1783ء میں لکھی گئی جس کی سن تصنیف مصنف کے اس مصرعہ سے برآمد ہوئی ہے۔ ''عجب قصہ ہے اسرار محبت''۔ اس مثنوی کا رضا لائبریری رامپور میں جو نسخہ ہے اس میں نہ تمہید ہے اور نہ ترقیمہ۔ اور اس میں کل 591 اشعار ہیں جو کہ 25 صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس مثنوی میں سسی پنوں کے قصہ عشق کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ قصہ اصل میں نثر میں تھا جس کو محبت نے مسٹر جانسن کی فرمائش پر نظم کا جامہ پہنایا۔

مثنوی اسرار محبت چونکہ محبت کی سچی کیفیتوں اور اس کے رموز و اسرار پر تحریر کی گئی ہے لہذا مثنوی کا آغاز ان

اشعار کے ذریعے ہوتا ہے جو محبت کی تعریف وستائش میں ہیں:

محبت نام اور ہر دل نگیں ہے
محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت
محبت ہے محبت ہے محبت
محبت بوئے گل، گل ہے محبت
محبت جز و کل، کل ہے محبت
محبت باطن اور ظاہر محبت
محبت اول اور آخر محبت
محبت چشم کو دے اشکباری
محبت دل کو سونپے بے قراری

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا میں نو اشعار لکھے گئے ہیں:

محمد مصطفے رنگ گل عشق
دو زلف ان کی بہار سنبل عشق

اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں چند اشعار لکھے ہیں:

اسے ہے عشق جو نفس نبی ہے
اسے ہے عشق جو مولا علی ہے

اس کے بعد اصل قصہ کی شروعات ہوتی ہے جس کے اشعار کچھ اس طرح ہیں:

بیاں کرتا ہوں اب اسرار عشق آہ
عجائب رنگ کے ہیں کار عشق آہ
محبت نے بہت بے جاں کیے ہیں
کہوں کیا جو جو کار ستاں کیے ہیں
انہیں میں سے یہ ایک افسانہ عشق

بیاں کرتا ہوں میں دیوانہ عشق

اس مثنوی کا سب سے دل چسپ وہ حصہ ہے جس میں محبت خاں نے سسی کا سراپا کھینچا ہے اس حصہ کو قلم کاری کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ محبت خاں نے سسی کے اس سراپے میں سر سے لیکر پیر تک اس کے حسن کی تعریف دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔ اور ساتھ ہی دل پذیر انداز میں تشبیہات و استعارات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ یہ سراپا 167 اشعار پر پھیلا ہوا ہے اور ان اشعار میں تسلسل کو بھی برقرار رکھا ہے گویا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہر شعر موتی کی لڑی کے مانند ہو۔ اسی وجہ سے ان اشعار میں اعلیٰ حسن کاری کا تاثر قائم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

چند اشعار دیکھیے:

سراپا کیا لکھوں اس شعلہ رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر
رگ ابر سیہ جیسے ہو مہ پر
دو پٹہ چاند تارے کا زری باف
جو اوڑھے تھی کر اپنی پٹیاں صاف
سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر
شب دیجور میں چمکے ہیں اختر

اس مثنوی میں واردات عشق کو بھی دل چسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سسی کے درد فراق کی حالت اور خیالات میں اس کے پنوں کے ساتھ ملاقات کے منصوبے تیار کرنا کہ کس طرح وہ پنوں سے ملاقات کریگی اور کیا کیا کہے گی پھر ان کے جواب میں پنوں کیا کہے گا وغیرہ یہ سب اشعار میر حسن کی یاد دلاتے ہوئے نظر آتے ہیں.

درج ذیل چند اشعار دیکھیے:

کبھی تو بستر غم پر بلکنا
کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکنا

کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا
کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
غرض دشوار تھا آرام پانا
کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا
کبھی اٹھنا تو پھر غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا
کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
منصوبہ بندی کی مثال
یہ کہتی تھی کہ اب جاکر ملوں گی
کل ہی دیکھو تو کیا کیا کچھ کروں گی
کہوں گی میں نہ کچھ تم ضبط کر کے
نہ بولوں گی کوئی دم ضبط کر کے
تو پھر یہ سن کے وہ کھاوے گا قسمیں
کہے گا میں بھی تھا گویا قفس میں
ندامت ہے نہایت اس کی مجھ کو
جو آئندہ ہو ایسا تو قسم لو
یہ سن کے اس سے مل جاؤں گی پھر میں
نہ شکوہ منہ پہ کچھ لاؤں گی پھر میں

یہ مثنوی منظر نگاری، طرز معاشرت، عصری رسوم اور دیگر دل چسپ خبریات سے محروم ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں جہاں تفصیل کی ضرورت تھی وہاں محبت خاں نے اختصار سے کام لیا ہے مثلاً اس قصہ میں سسی اور پنوں کی موت ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا سے نا کام اور نامراد لوٹتے ہیں۔ محبت خاں نے اس دردناک منظر کو صرف دو اشعار میں پیش کیا ہے۔

اشعار دیکھیے:

نہ دونوں نے کہی آپس میں کچھ بات
رہی بس حشر پر موقوف ملاقات
گئے حسرت بھرے دونوں جہاں سے
نہ کیوں کر غم ہو ان کی داستاں سے

یہ مثنوی اندرونی اور خارجی طور پر پھیل سکتی تھی لیکن محبت خاں نے خود کو قصہ کا پابند کر کے اس کے پھیلاؤ کو ختم کر دیا۔ پھر بھی اس کے باوجود ان کی ادبی صلاحیت ابھری اور انہوں نے سراپا نگاری اور جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جس کی وجہ سے وہ ایک اچھے مثنوی نگار کی طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

****

حوالہ جات

1۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی 1963، ص 372
2۔ایضاً، ص 377
3۔تاریخ روہیل کھنڈ (اردو ترجمہ تاریخ گل رحمت مع فارسی متن) مولف نواب سعادت یار خاں، مترجم و مرتب پروفیسر شاہ عبدالسلام، ڈائمنڈ پرنٹرز (دہلی) طبع اول 2002، ص 175
4۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی 1963، ص 296
5۔تاریخ روہیل کھنڈ (اردو ترجمہ تاریخ گل رحمت مع فارسی متن) مولف نواب سعادت یار خاں، مترجم و مرتب پروفیسر شاہ عبدالسلام، ڈائمنڈ پرنٹرز (دہلی) طبع اول 2002، ص 175
6۔حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس (کراچی) طبع ثانی 1963، ص 372

***

شاہ نیازؔ احمد بریلوی

شاہ نیاز احمد ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے قصبہ سرہند میں 1173ھ مطابق 1759ء میں پیدا ہوئے۔ سر ہند ریاست پنجاب کی ایک چھوٹی لیکن تاریخی بستی ہے جہاں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد رحمۃ اللہ علیہ سرہندی کا مزار مرجع خواص وعوام ہے۔ شاہ نیاز کا نام راز احمد رکھا گیا تھا بعد میں شاہ نیاز احمد المعروف شاہ نیاز کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ مخلوق سے بے نیاز تھے اسی باعث ''شاہ نیاز بے نیاز'' کہلائے۔ آپ شاہان بخارا کی اولاد سے ہیں جن کا دار الحکومت اندی جان تھا۔ آپ کے ایک بزرگ شاہ آیت اللہ علوی تاج وتخت چھوڑ کر ملتان آ گئے اور ان کے پوتے شاہ عظمت اللہ ملتان سے سرہند میں آ کر رہنے لگے۔

آپکے والد ماجد کا نام شاہ رحمت اللہ اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی تھا جن کو بی بی غریب نواز کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بچپن ہی میں شاہ نیاز احمد اپنے والد حکیم شاہ رحمت اللہ صاحب کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے جس کی وجہ سے والدہ نے پرورش اور تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دیے۔ مقامی علماء کی زیر نگرانی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے حضرت شاہ فخر الدین صاحب کی خدمت میں تکمیل تعلیم کے لئے دہلی پہونچے کیونکہ حضرت موصوف علوم باطن کے ساتھ ساتھ علوم ظاہر کے بھی بہت بڑے عالم تھے اور دور دور سے شائقین علم دہلی آ کر ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے۔ چناں چہ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''شاہ نیاز احمد صاحب 1173ھ میں بہ مقام سرہند پیدا ہوئے۔ والد ماجد حکیم شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا۔ والدہ ماجدہ نے پرورش کی اور تعلیم وتربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں شاہ فخر الدین صاحب کی خدمت بابرکت میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔'' [1]

غرض کہ ان کے زیر سایہ صرف سترہ سال کی عمر میں شاہ نیاز احمد نے تفسیر، حدیث، اصول وفروع، معقولات ومنقولات کے علوم میں کمال حاصل کرلیا اور ساتھ ہی کسب باطن کے لئے بھی بیعت کرلی۔ آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے نامور صوفی مانے جاتے تھے۔ باطنی علوم ومعارف کی تحصیل وتکمیل کے بعد شاہ نیاز احمد نے شاہ فخر الدین سے خلافت اور رشد وہدایت کی سند حاصل کی اور پیر ہی کی صلح پر بریلی میں سکونت اختیار کی لہٰذا بریلی ان کی مرجع خواص وعام بنی۔ جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''شاہ نیاز صاحب نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے۔ 17 سال کی عمر میں معقول ومنقول، فروع واصول، حدیث وتفسیر میں کمال حاصل کرلیا۔ علوم ظاہری سے فراغت حاصل ہوئی تو شاہ فخر الدین دہلوی کے دست مبارک پر بیعت کرلی۔ اور علوم باطنی کو طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر 19 سال تھی۔ آپ کی لیاقت استعداد اور سعی پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفہ راستیں مقرر کیا۔ اور بریلی میں اقامت کے ہدایت فرمائی۔'' ۲؎

شاہ نیاز اپنے علم فضل اور زہد وتقویٰ کے باعث شاہ فخر الدین کے مشہور ترین خلفاء میں بہت ممتاز تھے لہٰذا روہیل کھنڈ اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں یا ہندوستان کے دور دراز صوبوں میں تو معروف تھے ہی بیرون ممالک مانند افغانستان، سمرقند، شیراز، بدخشاں اور عرب ممالک میں بھی ان کے عقیدت مند مرید اور خلیفہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ آپ کے خلفاء کی تعداد سینتیس 37 تھی۔ آپ نے بریلی میں محلّہ خواجہ قطب کو دینی وروحانی مرکز بنایا تھا جو خانقاہ نیازیہ کے نام سے آج بھی تمام مذاہب کے لوگوں میں رشد وہدایت اور برکات تقسیم کررہا ہے۔

شاہ نیاز نے صرف رشد وہدایت کی مسند پر متمکن ہونا ہی پسند نہ فرمایا بلکہ درس وتدریس کی خدمات بھی عرصہ تک انجام دیں۔ دہلی میں ان کا حلقہ درس شائقین علم کے لئے بڑا ہی پر کشش اور مرکز توجہ تھا۔ ایسی محفلوں میں ان کی علمی موشگافیاں اصحاب ادراک وبصیرت کے نزدیک بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ اردو کے ممتاز شاعر اور قادر الکلام استاد مصحفی نے بھی دہلی کے زمانہ قیام میں ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب ریاض الفصحا میں بھی کیا ہے اور ان کی شان علم ووجاہت کو بھی بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

''مولوی نیاز احمد نیاز تخلص کہ بندہ در ایام طالب علمی شان عالم وجاہت ایشاں را دیدہ بلکہ چند روز میزان ہم از ایشاں در شاہجہاں آباد خواندہ بود زبانی صادر دارد۔'' ۳؎

شاہ نیاز کی پہلی بیوی لاولد تھیں کہ اس دنیا سے کوچ کرگئیں۔ آپ نے دوسری شادی کی جن سے آپ کے تین بچے ہوئے دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ مگر بیٹی چھوٹی عمر میں ہی انتقال کرگئی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام شاہ نظام الدین حسین تھا جو

تاج الاولیاء کے لقب سے مشہور ہوئے اور آپ کے انتقال کے بعد آپ کے سجادہ نشین بھی ہوئے۔ چھوٹے بیٹے کا نام شاہ نصیر الدین حسین مجرد تھا انہوں نے بدایوں میں سکونت اختیار کی اور وہیں رشد وہدایت کی شمع جلائی۔

شاہ نیاز نے 77 سال کی عمر پائی اور 6 جمادی الثانی 1250ھ مطابق 1834ء کو بریلی میں انتقال کیا۔ اور وہیں دفن ہوئے آپ کا مزار محلّہ خواجہ قطب بریلی میں ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''حضرت شاہ نیاز احمد صاحب نے 6 جمادی الثانی 1250ھ کو بمقام بریلی وصال فرمایا''

؎

تصانیف:

مروجہ علوم میں تکمیل کے بعد شاہ نیاز نے ایک طرف مسند درس کو سنبھالا تو دوسری طرف تصنیف وتالیف کی طرف بھی توجہ کی کیونکہ یہ بھی وقت کی اہم ضرورت تھی اور ان کے روحانی مشن کی ترویج واشاعت میں معاون ہو سکتی تھی۔ اسی لیے عموماً ایسے ہی موضوعات پر قلم اٹھایا جو اس عظیم مقصد کی تکمیل میں معاون ہو سکتے تھے۔ لہٰذا شاہ نیاز کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ بہ شمولیت دیوان آپ کی سترہ تصانیف کا علم ہو سکا ہے۔ جیسا کہ مسعود حسین نظامی آپ کی تصانیف کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ابھی تک مجھے صرف سترہ کتابوں کے بارے میں معلوم ہو سکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت اپنے طلبہ کو ان کے حسب استعداد مختلف مضامین پر رسائل املا کرا دیتے تھے۔ چوں کہ یہ رسائل انھیں حضرات کی تعلیم وتربیت سے متعلق ہوتے تھے اس لیے وہ اپنے ہمراہ دور دراز کے ممالک میں لے جاتے تھے۔'' ۵

اس کے بعد نظامی نے یہ فہرست کتب پیش کی ہے۔

1 شمس العین، 2 کشف العین، 3 نور العین، 4 مجموعہ قصائد عربیہ، 5 شرح قصائد عربیہ، 6 رسالہ راز ونیاز، 7 تحفہ نیاز، 8 تسمیۃ المراتب، 9 لیعرفون، 10 لیعبدون، 11 حاشیہ شرح چغمنی، 12 حاشیہ ملا جلال، 13 رسالہ منطق، 14 بیاض، 15 ملفوظات نیاز، 16 مجموعہ رسائل بر علوم مختلفہ اور 17 دیوان نیاز۔

شاہ نیاز ایک صوفی تھے ان کی طبیعت تصوفانہ تھی۔ عشق حقیقی سے ان کا خمیر بنا تھا اور درد عشق ہی ان کا سرمایہ حیات تھا۔ محبوب حقیقی کا یہ عاشق بادہ عرفان کا متوالا عشق حقیقی کی آتش میں خود بھی سلگتا اور اپنے آتشیں کلام کے ذریعہ

اپنے دل کی آگ کی حرارت دوسروں تک پہنچاتا۔شاہ نیاز شاعر سے زیادہ محبوب حقیقی کے عاشق اور جادہ صبر و رضا کے سالک تھے۔شاعری پیشہ نہ تھا اور نہ تفریح کا مشغلہ بلکہ جب جذبات کا طوفان امنڈتا تو اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ان کے کلام میں تصوف کے نکات،معرفت کے رموز،مشاہدہ باطن کے اسرار اور قلبی واردات کے بیانات بڑے دلکش اور دلنشین انداز میں ملتے ہیں۔آورد نام کو نہیں جو کچھ ہے آمد ہی آمد ہے۔ساتھ ہی زبان کی صفائی،سلاست اور روانی بھی کلام کے خاص جوہر ہیں۔وہ بلند خیالات کو بھی بڑی صفائی،سادگی اور دلکشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔چند اشعار دیکھیے:

بسا میری آنکھوں میں تو اس قدر
کہ تجھ بن نظر کچھ نہ آیا مجھے

وحدت ایسی ہوئی ہے جلوہ نما
ایک ہے سو ہزار آنکھوں میں

اک تو ہی نہیں میں بھی ہوں ان آنکھوں کا مارا
اے اہل نظر نرگس بیمار سے کہ دو

مجھے چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے اس بلا میں پھنسا دیا

شاہ نیاز بڑے ہی قادر الکلام اور فصیح البیان شاعر تھے اور ساتھ ہی فکر رسا بھی رکھتے تھے جس کا اعتراف اور احساس انہیں خود بھی تھا۔جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں۔

بھلا اک غزل اور بھی ایسی کہیو
تجھے میں فصیح البیان دیکھتا ہوں

رکھے ہیں نیاز یہ اہل دل ترے شعر سننے کا اشتیاق

غزل ایک دوسری اور کہہ تجھے حق نے فکر رسا دیا

لیکن انہیں جلد ہی یہ بھی احساس ہو جاتا ہے کہ شعروسخن کے جوڑتوڑ پیدا کرنا ان کا مسلک نہیں ہے بلکہ ذکر وفکر میں گم گشتگی ہی ان کا مقام ہے۔

عبث ہیں شعر و سخن کے یہ جوڑ توڑ نیاز
تو اپنے ذکر اور فکر کی طرف منہ موڑ

شاہ نیاز کے کلام میں ہندوستانی فضا اور رنگ و بو بھی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ان کی تشبیہات بھی اکثر ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں حالانکہ وہ خیال بندی کے قائل نہیں ہیں۔

نیاز شعر خیالی نہیں پسند عوام
غزل کہو تو کہو ٹک خیال بندی چھوڑ
عشق کے میداں میں آ صورت انساں بنا
عاشق مولا ہوا چاند کا جسے چکور

شاہ نیاز کا خاص موضوع سخن وحدت وجود یعنی "ہمہ اوست" ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا وحدت وجود کے خیالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور یہ مسئلہ صوفیانہ شاعری کی جان ہے۔ اسی مسئلہ کے ذکر و بیان سے صوفیانہ شاعری میں ذوق وشوق، جوش وخروش اور سوز وگداز پیدا ہوا ہے۔ شاہ نیاز نے اٹھارہویں صدی میں وحدت وجود کے نظریہ کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا اسی وجہ سے ان کے کلام کا اکثر حصہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ بطور مثال ایک غزل دیکھیے:

جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں
خدا ہی کا جلوہ عیاں دیکھتا ہوں
نہ تن دیکھتا ہوں نہ جاں دیکھتا ہوں
تجھی کو نہاں اور عیاں دیکھتا ہوں
اگر کوئی جان جہاں غیر حق ہے
سو میں اس کو دھوکا، گماں دیکھتا ہوں
یہ جو کچھ کہ پیدا ہے، سب عین حق ہے

کہ اک بحر ہستی رواں دیکھتا ہوں
کہاں غیر ہے اور کسے غیر جانوں
سوی اللہ کدھر ہے، کہاں دیکھتا ہوں
جسے ذات بے رنگ و بے چوں کہے ہیں
بہ ہرنگ جلوہ کناں دیکھتا ہوں
نیاز اب ہوا ناتوانی سے تو پیر
ولے عشق تیرا جواں دیکھتا ہوں

اسی مسئلہ کو ریاضی سے بھی ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو رشتہ ایک عدد کا دوسرے عدد کے ساتھ ہوتا ہے وہی خدا اور کائنات کے درمیان ہے۔

تعینات کے نقطوں سے ہے کثیر احد
وہی ہے ایک یہ دس سو ہزار لکھ کروڑ

ہیں دیدہ بنا میں ہم سارے کم و بسیار ایک
کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

شاہ نیاز وحدت ادیان کے قائل تھے۔ ان کی حریت فکر وضمیر کا یہ عالم ہے، کہتے ہیں۔

یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت
ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

شاہ نیاز ایک صوفی انسان تھے عشق الٰہی ان کے خمیر میں تھا۔ وہ عشق کے بندے تھے، عشق کی دنیا میں رہتے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں:

کہاں تک کہوں لطف و احسان عشق کہ جوں جوں گھٹا میں بڑھا یا مجھے

یہاں تک دیا مجھ کو حسین عروج کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دنیا میں پہنچ کر وہ عقل و ہوش کو الوداع کہہ دیتے ہیں:

جونہیں آمد آمد عشق کا مجھے دل نے مژدہ سنا دیا
خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجا دیا

جب بردر دل حضرت عشق آن پکارے
گوشے ہوئی عقل اور ہوئے اوسان کنارے

جذبات عشق جب ان کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

جوش زن ہے عشق کی مے اب خم دل میں نیاز
گہہ ابل کر وہ گرے گہہ خم سے نکلے پھوٹ پھوٹ

کیا جوش میں ہے اب مے وحدت خم دل میں
ابلی ہے پڑی رومی و عطار سے کہہ دو

آتش عشق ان کے سینے کو جلاتی ہوئی نظر آتی ہے، کہتے ہیں:

کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

جب اشکوں کا طوفان امنڈتا ہے تو بے اختیار شاہ نیاز کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ جاتے ہیں:

یا الہی زورق گردوں سنبھال
بے طرح اڈا ہے یہ طوفانِ اشک

پھر ایک لمحہ رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ حقیقتاً یہ اس کی یاوری کی ہے:

پھک چکے تھے ہم تو اے یارو ابھی
گر نہ ہوتا اس گھڑی احسان اشک

شاہ نیاز نے اپنے صوفیانہ خیالات، واردات قلبی اور مشاہدات باطنی کا اظہار شعر کی زبان میں کیا۔ ان کی

شاعری ''پختہ شدم'' سے شروع ہوتی ہے اور ''سوختم'' میں پہنچ کر نکھرتی جاتی ہے۔اور نسیان ما سوا اللہ اور اغراض من دون اللہ سے سرفرز ہونے کے بعد منزل سلوک میں مراجعت شروع کر دیتی ہے۔اس طرح ان کی شاعری کی ابتدا و انتہا عام صوفیانہ شاعری کی ابتدا و انتہا سے افضل و ممتاز نظر آتی ہے۔ان کی شاعری کا آغاز دراصل اس مقام سے ہوتا ہے جہاں عام صوفیوں کی شاعری ختم ہو جاتی ہے۔

شاہ نیاز تصوف کے شاعر تھے۔انہوں نے تصوف کے لیے غزل کے ڈھانچے میں رنگ تصوف بھرا۔جس کا مزاج فضا اور خوش بصری تصوف تھا۔اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ تصوف کے مدرس اور معلم تھے اور تصوف کی اصطلاحیں و اشارے صف در صف ان کے سامنے مود با کھڑے رہتے تھے۔لہٰذا وہ جب اپنے مشاہدات کو شعر کا وجود عطا کرتے تو تصوف کی زبان ہی اظہار خیال کا ذریعہ بنتی۔اسی وجہ سے وہ اپنے کلام میں تصوف کی باتیں نہایت بلیغ اور رواں انداز میں کر گئے۔

****

حوالہ جات

1۔تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی،اشوکا پریس (دہلی) طبع اول 1953،ص 562

2۔ایضاً ص 63-562

3۔ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) طبع اول 1985،ص 353

4۔تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی،اشوکا پریس (دہلی) طبع اول 1953،ص 573

5۔پیام مشرق از مسعود حسین نظامی،دہلی،اپریل 1967،ص 13

***

عشرتؔ بریلوی

میر غلام علی عشرتؔ کا نام میر غلام علی اور تخلص عشرتؔ تھا۔عشرت بریلی کے محلّہ گڑھیا کے رہنے والے تھے اور والد کا نام میر معظم علی مشہدی تھا۔جیسا کہ احمد علی خاں شوقؔ لکھتے ہیں:

''میر غلام علی تخلص عشرت، ابن میر معظم مشہدی۔۔۔۔بریلی میں محلّہ گڑھیا میں مکان تھا'' [۱]

تاریخ وتذکروں میں ہزار تلاش وجستجو کے بعد بھی عشرتؔ کے حسب ونسب، تعلیم وتربیت اور ان کی زندگی کے دوسرے اہم واقعات کا کوئی پتہ نہ مل سکا یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور صلاحیت کے بہت سے گوشے پوشیدہ ہیں۔ لے دے کے بس مثنوی پدماوت کا دیباچہ ہی ہے جس کی بنیاد پر ان کی زندگی کے کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ عشرت کی مختلف تصانیف میں داخلی شواھد کی بنیاد پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ عشرت اپنے عہد میں نظم ونثر کے استاد مانے جاتے تھے اور بالعموم تمام اہل کمال ان کے علمی مرتبے کے متعرف تھے۔عشرتؔ نے اپنے ان اشعار میں اپنے سادات مشہدی ہونے، اپنے نام، حسب ونسب اور وطن وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میرا نام ہے گا غلام علی
بصد دل خریدار نام علی
ہے حسب و نسب میری سادات سب
غرض مشہدی ہوں بحسب و نسب
سکونت بریلی میں مدت سے ہے
کہ آئے تھے اجداد فرخندہ پے

جو تھا شوق اشعار میرے تئیں
یہ عشرت ہوا میں تخلص گزیں[2]

عشرتؔ کی پیدائش کب ہوئی اس حوالہ سے بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ طبقات الشعراء میں شوقؔ نے جوان بتایا ہے اور مصحفیؔ نے ریاض الفصحا میں چالیس سال کی عمر بتائی ہے۔

شوقؔ لکھتے ہیں:

''غلام علی عشرت، متوطن بلدہ بریلی، جوانے است۔'' [3]

مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''میر غلام علی عشرت تخلص ساکن صوبہ بریلی جوان کثیر الکلام است دیوان ہا و مثنوی ہائے متعددہ دارد عمرش تخمینا چہل سالہ خواہد بود'' [4]

طبقات الشعراء 1774ء میں مکمل ہوا تھا لیکن شوقؔ نے اس میں 1794ءتک اضافہ کیے تھے۔ اور ریاض الفصحا 1806ء سے لیکر 1821ءتک لکھا گیا۔

اب اگر شوقؔ نے عشرت کا ذکر 1794ء میں کیا ہوگا اور اس وقت ان کی عمر جوان سے مراد 25 سال لی ہوگی تو اس حساب سے عشرتؔ کی سن پیدائش 1770ء بیٹھتی ہے اور اگر ذکر پہلے کیا ہوگا تو پھر یہ سن ولادت اور پیچھے جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر مصحفیؔ نے عشرتؔ کا ذکر 1806ء میں کیا ہوگا تو اس حساب سے سن پیدائش 1766ء بیٹھتی ہے۔

قرینہ قیاس بھی یہی ہے کیوں کہ مصحفیؔ نے عشرتؔ کے لیے جن الفاظ کا ذکر کیا ہے (کثیر الکلام است دیوان ہا و مثنوی ہائے متعددہ دارد) وہ کسی نو مشق کے لیے نہیں ہو سکتے۔ اور کسی کا پندرہ بیس سال کی عمر میں متعدد مثنوی و دیوان کا لکھ دینا ناممکن سی بات لگتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہوسکتا ہے مصحفی نے عشرت کا ذکر 1820ء میں کیا ہو؟۔ تو ایسی صورت میں شوق کے (جوان) والے قول کی مخالفت لازم آئے گی۔ کیوں کہ اگر 1820ء میں عشرت کو چالیس سال کا تسلیم کیا جائے تو اس حساب سے عشرت کی پیدائش 1780ء بیٹھتی ہے۔ اور 1780ء اور 1794ء کے درمیان محض 14 سال کا فرق رہ جائے گا اور 14 سال کی عمر میں کسی کو جوان نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عشرت کی پیدائش 1766ء سے 1770ء کے درمیانی حصہ میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

عشرت کے بیٹے کا نام میر سعادت علی عیش تھا جیسا کہ مثنوی ریاض الحسین کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے جس

میں وہ اپنے بیٹے کے لیے دعا گو ہیں۔

سعادت علی میرا نور البصر
تمہاری محبت سے ہو بہرہ ور
یہی اسکو توفیق ہووے نصیب
رہے غم میں شبیر کے با شکیب
بمدح ثنا ہائے اثنا عشر
رہے تر زبان وہ بھی شام و سحر
بحق و بتول و حسین و حسن
بحق دہ دو شہ ذوالمنن ۵؎

میر سعادت علی عیش کے علاوہ عشرتؔ کی کسی اور اولاد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

عشرتؔ فن شعر میں مرزا علی لطف شاگرد مرزا سوداؔ، کے شاگرد تھے۔ عشرتؔ نواب نصر اللہ خاں سلطان کے زمانہ میں 1211ھ مطابق 1796ء میں تلاش معاش اور احباب کی محبت اور تقاضوں کی بنا پر رامپور چلے آئے تھے۔ اور یہاں محمد عثمان خاں اور احمد خاں صاحب جو کہ نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے بھانجے تھے اور نسبت فرزندی بھی رکھتے تھے، کی ملازمت اختیار کی۔ عشرتؔ پدماوت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''خاکسار بے مقدار سید غلام علی مشہدی متخلص بہ عشرت ساکن بریلی ابجد خوان دبستان مرزا علی لطف صاحب سلمہ اللہ تعالی کہ ذات با برکات ان کی ذوق یاب شعر و شاعری کے کلام کرامت نظام مرزا رفیع السودا مرحوم و مغفور سے ہے، بلکہ شاگرد رشیدان کے ہیں۔ چندروز سے سن بارہ سو گیارہ میں درمیان شہر رام پور کے کہ نام خاص اس شہر بلند اور بلدہ ارجمند کا مصطفیٰ آباد ہے، بجہت الفت بعضے یاران نکتہ پرداز اور دوستان محرم راز کے وارد تھا۔ الخ''

۶؎

عشرتؔ کو رامپور میں خصوصیت کے ساتھ مولوی قدرت اللہ شوقؔ سے بڑی قربت اور محبت تھی۔ شوق کی قیام گاہ پر ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ مجلس مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی جس میں شہر کے دیگر نامور شعرا مثلاً حافظ بڈھن شیفتہؔ، غلام جیلانی رفعتؔ، ہمت خان ہمتؔ، مولوی محمد اکرامؔ نسیمؔ، کبیر خاں تسلیمؔ اور سید رفیع الدرجات کے علاوہ عشرتؔ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ عشرتؔ نے شوق اور انہیں احباب کی فرمائش پر عبرت کی ادھوری مثنوی پدماوت کو مکمل کیا تھا۔

عشرت کے شاگردوں میں میر سعادت علی عیشؔ، احمد خان احمدؔ، امیر الدین آزادؔ، مائلؔ اور شیخ احمد حسین راحتؔ و غیرہ گزرے ہیں۔ بعد میں ان کے شاگردوں کے بھی کئی شاگرد ہوئے جو روہیل کھنڈ میں خاص مقام رکھتے تھے۔

عشرتؔ کا انتقال 1236ھ مطابق 1821ء نواب احمد علی خاں کے دور حکومت میں ہوا۔ اور مولوی عبد الملک ممتازؔ نے ''ہائے میر عشرت'' مادہ تاریخ کہا جس سے 1236 اعداد نکلتے ہیں۔ احمد علی خاں شوقؔ لکھتے ہیں:

''بارہ سو چھتیس ہجری میں بعہد نواب احمد علی خاں صاحب بہادر 1225ھ لغایت 1256ھ
میں انتقال ہوا۔ مولوی عبد الملک ممتاز نے 'ہائے میر عشرت' مادہ تاریخ کہا۔'' ے

اس کے علاوہ اسی صفحے پر احمد علی خاں شوقؔ نے عنبر شاہ خاں کا لکھا ہوا ایک قطعہ تاریخ وفات بھی درج کیا ہے۔

چوں موسم بہاراں در بوستان دوراں
گل کرد از شگوفہ ناگاہ مرگ عشرت
از شور عندلیباں اندر چمن شیون
تاریخ مرون او شد، آہ مرگ عشرت

تصانیف:

مصحفی نے عشرت کی متعدد مثنوی و دیوان بتائے ہیں لیکن وہ اب دستیاب نہیں، جو کارنامے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں دو مثنوی ایک داستان اور غزلیات پر مشتمل ایک دیوان ہیں۔

۱۔ مثنوی پدماوت

۲۔ مثنوی ریاض الحسین

۳۔ دیوان غزلیات

۴۔ داستان سحر البیان

۱۔ مثنوی پدماوت:

اس مثنوی کی بنیاد ملک محمد جائسی کی اودھی پدماوت ہے جس میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور سنگلدیپ کی شہزادی پدماوت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کو دراصل میر ضیاء الدین عبرت نے مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں کی فرمائش پر شروع کیا تھا لیکن 1788ء میں انتقال ہونے کی وجہ سے یہ مثنوی نامکمل رہ گئی۔ اس کے بعد عشرت نے اس کے بقیہ تین

حصے قدرت اللہ شوقؔ اور دیگر احباب و معاصرین کے کہنے پر ڈیڑھ ماہ میں مکمل کیے۔ جس کا ذکر عشرت نے خود اس مثنوی کے دیباچہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''الغرض ترغیب دینے مولوی صاحب سے اور بھی کرم فرما میرے چنانچہ مشفق و شفیق حافظ بڈھن صاحب متخلص بہ شیفتہ کہ سر آمد شعرائے ہندی و فارسی کے ہیں۔۔۔مولوی غلام جیلانی رفعت، و ہمت خان ہمت و مرزا کرامت علی اکرم و عنبر شاہ رقم۔۔۔شجاعت علی نسیم، و کبیر خاں تسلیم۔۔۔رفیع الدرجات عالی مرتب، نور چشم ضیاء الدین عبرت اور ک ءآشنا مجوز اس کے ہوئے کہ نظم کرنا قصہ باقی ماندہ کا عین صلح ہے۔۔۔خوشی خاطر یاروں کو اوپر سب کاروبار کے مقدم رکھیے اور اس داستان ناتمام کو پورا جلد کیجیے۔۔۔باقی ماندہ یہ قصہ۔۔۔ یک و نیم ماہ میں۔۔۔تمام کیا۔۔۔اور مادہ تاریخ اتمام۔۔۔''تصنیف دو شاعر'' کے بہتر نہ پایا۔۔۔اور سب نے متفق ہو کر فرمایا کہ یہ مادہ تاریخ الہام غیبی ہے۔'' ۸؎

یہ مثنوی پہلی مرتبہ مطبع مصطفائی لکھنؤ سے 30 مارچ 1848ء میں شائع ہوئی اور دوسری مرتبہ نولکشور کانپور سے 1885ء میں شائع ہوئی۔

مثنوی کے داخلی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرت و عشرت دونوں میں سے کسی نے بھی جائیسی کی اودھی پدماوت کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ عبرت نے فارسی ترجمے 'شمع و پروانہ، جس کو عاقل خاں رازی نے عہد عالمگیر 1659ء میں نظم کیا تھا' کو اپنا محور بنایا ہے اور عشرت نے فارسی ترجمے 'جس کو ملا عبدالشکور بزمی نے عہد جہانگیر 1618ء میں نظم کیا تھا' کو اپنا محور بنایا ہے۔ عبرت نے اس بات کا اعتراف پدماوت کے حصہ (وصف ہندوستان جنت نشان اور عذر مصنف اس داستان ندرت بیان کا) میں کیا ہے۔ بیان کرتے ہیں:

رقم جو ہے یہ مضموں شعلہ بنیاد
میری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
نہ سرقہ ہے نہ کوئی مبتذل ہے
توارد لیکن اس کا محتمل ہے
مگر مضمون عاقل خان رازی
کہ اوس نے داستان یہ فارسی کی
تیمن کے طریق اس میں ہے داخل

کہ میں اوس کے مقولہ کا ہوں ناقل9

یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنوی میں جائیسی کی سادگی، اثر خیزی، صوفیانہ رموز واشارات اور خالص ہندی فضا کے بجائے تکلف، حسن بیان، عصری رجحانات، درباری فضا اور انیسویں صدی کا داستانی رنگ ملتا ہے۔

عبرت 1279 اشعار لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا ان کے آخری اشعار یہ ہیں:

رہا جو منتظر اوس کا سحر شام
سفید آنکھیں ہوئیں جو مغز بادام
گہے بنتا تھا اور گاہے بگڑتا
نصیب دل سے تھا دن رات لڑتا

یہاں سے آگے عشرت نے اس مثنوی کو لکھنا شروع کیا اور اس شعر کے ساتھ ابتدا کی۔

کہا یہاں تک یہ قصہ بس ضیاء الدین عبرت نے
اب اوس کا شوق ہر دم مجکو یوں رغبت دلاتا ہے

اور یہاں سے آخر تک کل 2072 اشعار عشرت نے کہے ہیں۔ اس طرح عبرت وعشرت کے کل اشعار کی مجموعی تعداد 3351 ہوتی ہے۔

عبرت کا رنگ سخن دیکھنے کے لیے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ پدم کا طوطا جب قفس سے اڑ جاتا ہے تو وہ کس طرح پریشان ہوتی ہے۔

قفس خالی جو دیکھا غم کی ماری
برنگ نوحہ پرداز اں پکاری
کہ تیرا سبز رنگ اے طائر زار
ہوا جوں زہر رگ رگ سے مرے پار
خیال اوس تیز شہپر کا غم انگیز
گذرتا دل ہے سے جوں خنجر تیز
تری منقار کی یاد اے ستمگر
دہکتے دل پہ رکھ دیتی ہے اخگر

پتنگ آسا یکا یک منہ کو تو موڑ
محبت کی گیا ہے ڈور کو توڑ
ہوا پر دیکھتی ہو جب پکھیرو
سمجھتی ہوں کہ آیا میرا مہرو
گذر جاتا ہے جب طائر ہوا پر
زمیں پر دے پٹکتی ہوں وہیں سر

یہ اشعار مثنوی گلزار نسیم سے پچاس سال پہلے لکھے گئے ہیں۔ مگر صاف محسوس ہوتا ہے کہ بکاؤلی پھول کے غائب ہونے پر جس طرح اظہار غم کرتی ہے اسی طرح پدم قفس کے خالی ہونے پر کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبرت کو زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل تھی ان کے یہاں صنائع بھی ہے اور حسن کاری بھی۔

عشرت کا رنگ عبرت سے ذرا مختلف ہے ان کے یہاں سادگی وسلاست ہے اور روانی و برجستگی بھی۔ عشرت سادگی میں حسن و دلآوزی پیدا کرتے ہیں۔ عشرت کا رنگ میر حسن سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔

عشرت کے رنگ سخن کا ان چند اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح معشوق کے سراپا، بیان شراب وصال، غسل اور سیر تماشے میں عشرت نے تفصیل وتوضیح اور جزئیات نگاری کو کام میں لیا ہے۔ یہ صاف طور سے میر حسن کی یاد دلاتا ہے۔

ہزاروں پالکی فیل و عماری
جواہر جس پہ تھے صرف تیاری
ہزاروں تھے مرصع اور مطلا
تھی کلسی جنکی مہرومہ سے زیبا
چڑھا کوئی شتابی پالکی پر
چلا کوئی چڑھ اپنی نالکی پر
کوئی فیل سیہ پر جلوہ گر تھا
کہے تو ابر کے اوپر قمر تھا
کسی نے ہے سواری رتھ کی تاکی

کہ ہے گی یہ سواری دیوتا کی ہے

عشرت وعبرت دونوں دوجدا جدا رنگ شاعری کے نمائندے ہیں اس کے باوصف تمام پد ماوت عشقیہ شاعری، جذبات کی تحلیل، جزویات نگاری اور عصری رسومات حالات سے بھری پڑی ہے۔ کام ودہن کی یہ شاعری اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔مثنوی ریاض الحسین:

عشرت نے اس مثنوی کو 1223ھ مطابق 1808ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس کا مکمل نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ اور اس نسخہ کے سرورق پر ریاض الحسین یا روضۃ الشھد امنظوم لکھا ہوا ہے، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں اور اس میں کل 453 اوراق اور ہر صفحے پر 15 اشعار ہیں اس طرح اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً 13590 ہے۔ یہ نسخہ میاں عظیم اللہ نے ملا شیر محمد آخون کے لیے 1836ء میں نقل کیا تھا یعنی اصل نسخہ سے 28 سال بعد کا یہ نسخہ ہے۔

اس تصنیف کا مقصد ثواب دارین اور فلاح دین ودنیا حاصل کرنا تھا جس کو عشرت نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ہوا ایمان و علم و عمل در نصیب
بہر دو جہاں عیش و منصب نصیب
بفضل خدا اب یہ آیا خیال
نکر عمر کو ضائع در خط و خال
کیا عہد دل میں برب کریم
کہ دنیا میں جب تک رہونگا مقیم
خدا تیرے میں فضل سے در جہاں
رہونگا بہ نعت نبی بر زباں
ائمہ کی دائم لکھوں گا ثنا
کہ دنیا و دیں میں ہیں وہ مقتدا
عزیزو جو یہ عہد میں نے کیا
برائے خدا تم بھی مانگو دعا

کہ حق ہو مددگار میرا مدام
بحق محمد علیہ السلام
لہذا ہوں تصنیف کرتا کتاب
کہ جس کا صلہ لوں بروز حساب

اس مثنوی میں کل بارہ ابواب ہیں جس کی تفصیل عشرت نے اس طرح پیش کی ہے۔

یہ تصنیف تالیف کی یہ کتاب
کی بارہ اسی طرح تحریر باب
کہ اول جو ہے باب زیب زباں
ہے آدم سے تا حال یحیی بیاں
دوئم باب مجمل بحال رسول
سیم باب در واردات بتول
چہارم باخبار صدیق دین
وصی نبی شہ مرسلین
ہے پنجم بحال حضور عمر
خلیفہ دویم بعد خیر البشر
ششم میں مناقب ہیں عثمان کے
کہ جامع ہیں وہ جملہ قرآن کے
ہے ہفتم بحال شہ ذوالفقار
علی ولی شیر پروردگار
ہے ہشتم با وصاف ذکر حسن
ولادت، شہادت کے رنج و محن
نہم واقعہ مسلم ابن عقیل
حسین ابن حیدر کا بھائی وکیل

دہم باب ذکر امام حسین
سرور دل سید مشرقین
لکھا گیارواں باب میں وہ کلام
کہ سر شامیاں لے گئے سوئے شام
کیا بارواں باب میں جو بیاں
سو عابد سے لے تا بمہدی عیاں
الٰہی یہ مقبول ہو جو کلام
بحق حسن اور حسین امام

باب اول کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے۔

''ابتدائے احوال حضرت آدم علیہ السلام و پیدائش حوا رضی اللہ عنہا''

اس باب کے 13 صفحات میں حضرت آدم و حوا کی پیدائش، ان کا داخلہ جنت، شیطان کی وسیسہ کاری، جنگ ہابیل و قابیل اور ہابیل کی شہادت حضرت امام حسین کی طرح، طوفان نوح، قصہ حضرت ابراہیم و یوسف وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ بیچ بیچ میں نوحے اور غزلیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ 68 صفحے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تفصیلی حالات 166 صفحوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ خلفائے راشدین کے احوال اختصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں سارا زور ائمہ کی منقبت اور مداحی میں صرف کیا گیا ہے۔ مجلس عزاء میں نوحہ گری اور جزوی طور پر مرثیہ خوانی کی رسم اس سے خوب پوری ہو سکتی ہے۔ صرف نوحوں کی تعداد اگر شمار کی جائے تو کئی سو ہو گی۔ ہر اہم واقعہ کو وہ اس طرح موڑتے ہیں کہ وہ نوحہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً یوسف علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے امام حسین کی تشنہ لبی یاد آنے پر جو نوحہ لکھتے ہیں اس کے چند اشعار دیکھیے:

عجب طرح کا اس پہ گزرا الم
کہ عاجز ہے جس میں زبان قلم
ذرا غور کیجیو بدرد و بکا
ہوا تشنہ لب جب شہ کربلا
سر سرور دیں مہ اقربا

بخوں غرق نیزے کے اوپر چڑھا

یہی وجہ ہے کہ ریاض الحسین میں اعلیٰ درجہ کی شاعری نہیں صرف واضح بیانات ملتے ہیں۔ اگر عشرت کا ماحول سازگار ہوتا، ادبی قدریں بلند ہوتیں، ان کے بیشتر و کے کچھ نمونے عظیم فنی بلندیوں کے حامل ہوتے تو مثنوی ریاض الحسین کے موضوع اور اس کے خالق میں یہ صلاحیت تھی کہ اسے ایک عظیم اور بلند مرتبہ رزمیہ کی شکل دے سکتی مگر ایسا نہ ہو سکتا البتہ اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔دیوان غزلیات:

مصحفی نے عشرتؔ کے لیے ''جوان کثیر الکلام است دیوان ہا و مثنوی ہائے متعددہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پدماوت اور ریاض الحسین کے علاوہ ان کی اور کئی مثنویاں تھیں جواب نایاب ہیں اسی طرح ان کے دیوان بھی تعداد میں کئی ہونگے۔ لیکن فی الحال عشرتؔ کا ایک ہی دیوان موجود ہے جو رضا لائبریری میں ہے۔ اس دیوان کو حافظ احمد علی خاں شوقؔ نے 1915ء میں رضا لائبریری رامپور میں رکھا تھا جس کے متعلق انہوں نے خود بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آپ کا دیوان اردو مکمل نہایت بوسیدہ مجھے مل گیا۔ ستمبر 1915ء میں میں نے ریاست کے کتب خانہ کے لیے خرید لیا۔ تقریباً تین سو صفحات ہیں۔ نہایت اچھا کلام ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصل مسودہ ہے۔ کہیں کہیں شعروں کی جگہ خالی ہے۔'' [۱۰]

اس دیوان میں نہ تمہید ہے، نہ ترقیمہ اور ساتھ ہی ناقص الآخر بھی ہے۔ اس میں کل 168 اوراق یا 336 صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر اوسطاً 12 اشعار ہیں، کل تقریباً 533 غزلیں اور تقریباً 4033 اشعار ہیں۔ سب سے زیادہ تقریباً 91 غزلیں ردیف 'الف' پر ہیں۔ اس کے علاوہ مخمس اور دیگر متفرق اشعار آخری دس اوراق 159 تا 168 میں ہیں۔ حروف خوش خط اور کہیں کہیں اوراق کرم خوردہ ہیں۔

پہلی غزل کے اشعار اس طرح ہیں:

روز تقسیم حسن دلبر تھا
عشق تھا آگ میں سمندر تھا
رات نلوں سے شور محشر تھا
ایک عالم غرض تل اوپر تھا

زلف سے کیوں نہ دل کو ہوتا ربط
وہ پریشان تھی یہ بھی ابتر تھا
صاف باتوں سے ہم سمجھتے تھے
کہ مزاج آپ کا مکدر تھا
در تلک آکے پھر گئے صاحب
بندہ پرور کہو تو کیا ڈر تھا
بے حجابانہ آگئے ہوتے
کیا تکلف تھا آپ کا گھر تھا
ماجرا میری چشم کا عشرت
رقت نوح سے فزوں تر تھا

عشرتؔ کی غزلوں میں عام طور پر خارجیت، نمائش ظاہری، سطحیت اور وقتی لطف اندوزی کے جذبات نمایاں ہیں۔ عنفوان شباب کی بے صبری، منچلے پن کی بہتات اور گہرائی و گیرائی کی کمی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ جذبات میں گداز اور فکر و خیال کی رعنائی کا تقریباً فقدان ہے۔ ان کی غزلوں کی بے نمکی اور پھیکے پن کی پہلی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ امرائے رامپور کی حضوری سے وابستہ تھے خود لکھتے ہیں:

''شب و روز ان کی بندگی میں تھا اور واسطے حظ طبع اون کی کے غزلیات تازہ کہتا'' [11]

ایسے ماحول میں برابر آمد اور بے ساختگی کی توقع بہت مشکل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آورد اور صناعی جو بعد میں دبستان لکھنؤ کا طرہ امتیاز بنیں ان کے یہاں نمایاں رہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عشرت نے جس ماحول میں پرورش پائی اس کا عام شوق کام و دہن کی شاعری سے لطف حاصل کرنا تھا۔

عشرت کی غزلوں میں ایسا بھی نہیں ہے کہ خوبصورت اور پاکیزہ اشعار کا بالکل ہی فقدان ہو۔ بلکہ بعض غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں فضا کی تازگی اور اثر انگیزی نظر آتی ہے۔ مثلاً چند اشعار دیکھیے:

گو مجھے اس میں برا یا بھلا کہتے ہیں
میں ہوں اور عشق ہے کہنے دو یہ کیا کہتے ہیں
دل دیا میں نے تو اپنا ہی دیا ہے یارو

کیا بھلا اس میں کسی کا جو برا کہتے ہیں

آج ہی تو نے جلایا نہ دل ایک عالم کا
یہ شرارت تو لڑکپن سے تری ذات میں ہے

آہ کیا سوزش دل اپنی کہوں شمع کی طرح
آتش غم سے سراپا میں جلا جاتا ہوں

عشرت کے یہ اشعار تو صاف طور سے میر کے رنگ کی یاد دلاتے ہوئے نظر آتے ہیں:

مشتاق نہ میں دیر کا طالب نہ حرم کا
ہوں زائر دل گوشہ نشیں خلوت غم کا
ہے ہائے جو یہ ہستی موہم پہ ہر گل
روتی ہے یہ شبنم کہ بھروسہ نہیں دم کا

شکوہ جور و جفا کیجئے کس کا ہمدم
دشمن جاں ہے بغل میں دل مضطر اپنا

سمجھے وہی تپش کو مرے دل کی جو کوئی
ہو کشتہ نگہ کسی غفلت پناہ کا

عشرت کے مزاج وظرافت کا رنگ بھی بالکل سادہ اور عام فہم ہے۔تبسم زیرلب نہیں بلکہ قہقہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔اشعار دیکھیے:

ہے گلشن دنیا میں کل انبار خچنڈی
ترکاریوں میں سب سے مزہ دار خچنڈی
ہم خوش ہوں اسی شخص سے خوش اس سے خدا ہو

پکووا کے کھلاوے ہمیں دو چار خجنڈی

عشرت کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ اشعار میں الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کو جس طرح چاہتے نگینہ کی طرح جڑ کر دیتے اسی وجہ سے ان کے بعض اشعار میں ترنم و روانی غضب کی پائی جاتی ہے۔ مثلا

نہ دل کو آرام جانکنی میں نہ چین
راتوں کو خواب میں ہے
جو کچھ کہ حالت ہے عاشقوں کی
سو مری حالت خراب میں ہے

اس لطافت سے پسینہ کیا کہیں
صبح برگ گل پہ شبنم دیکھ لو

عشرت کو فارسی تراکیب اور الفاظ کے استعمال پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے وہ کہیں کہیں فارسی کے خوبصورت مصرعوں اور فقروں کو بڑی برجستگی سے استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلا

کہتے ہو مجھے زاہد صحبت بکتاب اولیٰ
مئے نوشی و مدہوشی دونوں کو جواب اولیٰ
مجھ رند کو اے صاحب کب ہے یہ حساب اولیٰ
ایں خرقہ کہ من دارم و دہن شراب اولیٰ
ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

یہ اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ عشرت میدان سخن کے ایک باکمال شہسوار تھے۔ ان کی استادانہ صلاحیتیں اور فنی حسن ان کے شاعرانہ کمال پر دال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علاقہ روہیل کھنڈ کے بعض شعرا نے عشرت کے اس رنگ سخن کو اپنایا اور عرصہ دراز تک اس رنگ سخن میں شاعری کرتے رہے۔

****

حوالہ جات

1۔تذکرہ کاملان رامپور از حافظ احمد علی خاں شوق، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس دریا گنج (نئی دلّی) طبع ثانی 1986،ص 301

2۔مثنوی ریاض الحسین قلمی از غلام علی عشرت، مخزونہ رضا لائبریری رامپور

3۔طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوق، مرتب نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1968،ص 614

4۔ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985،ص 242

5۔مثنوی ریاض الحسین قلمی از غلام علی عشرت، مخزونہ رضا لائبریری رامپور،ص 1

6۔مثنوی پدماوت از ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت، مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1967، ص 62

7۔تذکرہ کاملان رامپور از حافظ احمد علی خاں شوق، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس دریا گنج (نئی دلّی) طبع ثانی 1986،ص 302

8۔مثنوی پدماوت از ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت، مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1967، ص 66،67

9۔ایضاً،ص 99،100

10۔تذکرہ کاملان رامپور از حافظ احمد علی خاں شوق، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس دریا گنج (نئی دلّی) طبع ثانی 1986، ص 302

11۔مثنوی پدماوت از ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت، مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مجلس ترقی ادب (لاہور) 1967، ص 62

***

احمد خان غفلتؔ

غفلتؔ کا نام اخون زادہ احمد خاں، تخلص غفلتؔ اور والد کا نام برہان الدین تھا اور قوم کے یوسف زئی افغان تھے۔ غفلت کی پیدائش کے حوالہ سے بھی کسی تذکرہ نگار یا خود غفلت نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ کس تاریخ یا سنہ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ البتہ امیر مینائی نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ انہوں نے چونسٹھ سال کی عمر پائی۔ لکھتے ہیں:

''چونسٹھ برس کی عمر پائی۔ بارہ سوانسٹھ ہجری میں یکم ذوالحجہ کو رحلت فرمائی'' [1]

اب جبکہ غفلتؔ نے چونسٹھ سال کی عمر پائی اور 1259ھ میں ان کا انتقال کیا تو ان کی اس تاریخ وفات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش رامپور میں تقریبا 1195ھ مطابق 1781ء میں ہوئی ہوگی۔

غفلتؔ نے درسی کتابیں مولوی قدرت اللہ شوقؔ سے پڑھیں اور شاعری میں بھی شوقؔ سے ہی شرف تلمذ حاصل کیا۔ احمد علی خاں شوق لکھتے ہیں:

''اخون زادہ احمد خان تخلص غفلتؔ ولد برہان الدین خاں رامپور میں پیدا ہوئے۔ مولوی قدرت اللہ شوق سے کتابیں پڑھیں۔ طبیعت نہایت رسا پائی تھی'' [2]

غفلتؔ نے جس وقت ہوش سنبھالا تو روہیل کھنڈ میں قائمؔ چاند پوری اور ان کے بعد شوقؔ کا ہی دور دورہ تھا۔ شوقؔ کو اس وقت کا سب سے بڑا استاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے غفلتؔ نے بھی شوقؔ کی شاگردی اختیار کی اور درسی علوم وفنون اور شاعری کے ساتھ ساتھ استادی کے بھی سارے ہنر سیکھے۔ جب تک شوقؔ کا انتقال ہوا غفلت استادی میں منجھ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شوقؔ کے انتقال 1224ھ مطابق 1810ء کے بعد غفلتؔ اپنے وقت کے سب سے بڑے استاد کہلائے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں اپنے شاگرد چھوڑے جنہوں نے روہیل کھنڈ کی سرزمین کو اپنے علم وادب کی روشنی سے خوب منور کیا۔ جن میں سے احمد اللہ خان احمدؔ، میر شرف الدین ششدرؔ، مولوی محمد شیداؔ، محمد سعادت علی خاں

طلعتؔ، مولوی محمد قیام الدین فرقتؔ، غلام رسول خاں مشتاقؔ، محمد سعدالدین خاں شعورؔ، محمد ضیاء خاں یاسؔ اور شیخ علی بخش بیمارؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ نواب صاحب کے کئی عزیز بھی ان کے شاگرد تھے۔ مثلاً صاحبزادہ اشرف علی خاں اشرفؔ، صاحبزادہ اصغر علی خاں افکارؔ، صاحبزادہ امداداللہ خاں تابؔ، صاحبزادہ غلام محی الدین خاں حزیںؔ، صاحبزادہ امداد علی خاں امدادؔ، صاحبزادہ غلام حضرت خاں زخمیؔ، صاحبزادہ عبدالقادر خاں قادرؔ اور صاحبزادہ فصیح اللہ خاں مفتوںؔ وغیرہ۔

غفلتؔ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رامپور میں ہی گزارا بس کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے مصحفیؔ سے ملاقات بھی کی اور مشاعروں میں بھی شریک رہے۔ امیر مینائیؔ لکھتے ہیں:

''اکثر وطن میں رہے۔ چندے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے وہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے تھے'' ۳

مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''ازاں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود'' ۴

اس کے بعد غفلتؔ رامپور واپس چلے آئے اور یکم ذوالحجہ 1259ھ مطابق 1843ء میں رامپور میں انتقال کیا۔ جیسا کہ امیر مینائیؔ نے لکھا ہے:

''چونسٹھ برس کی عمر پائی۔ بارہ سو انسٹھ ہجری میں یکم ذوالحجہ کو رحلت فرمائی'' ۵

تصانیف:

غفلتؔ کی اب تک صرف دو ہی تصنیف دستیاب ہوسکی ہیں۔ تعجب خیز بات ہے کہ اپنے وقت کے جلیل القدر استاد، قادرالکلام شاعر اور مختلف علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھنے کے باوجود ان کی تصانیف کی تعداد بہت مختصر نظر آتی ہے۔ ہوسکتا ہے ان کی بھی دیگر اساتذہ اور شعرا حضرات کی طرح متعدد تصانیف رہی ہوں لیکن ضائع ہونے یا کسی دوسری وجوہ کی بنا پر ہم تک نہ پہنچ پائیں ہوں۔ خیر ان کی دستیاب شدہ تصانیف یہ ہیں۔

ا۔ قصہ فسانہ رام وسیتا موسوم ظفر کام:

غفلتؔ نے اس قصہ کو نواب احمد علی خاں رند کی فرمائش پر 1242ھ میں اردو نثر میں تحریر کیا تھا۔ جو رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

۲۔ دیوان:

یہ دیوان 310 صفحات پر مشتمل ہے۔اس دیوان میں تقریباوہ تمام تر اصناف سخن موجود ہیں جن میں غفلت نے طبع آزمائی کی ہے۔مثلاقصائد،غزلیات ،مثنویات ،ہجویات،قطعات تاریخ وفات اور رباعیات وغیرہ۔اس دیوان کو فتح خاں خوش نویس نے لکھاہے جوکہ رضالائبریری رامپور میں موجود ہے۔

غفلتؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے جنہوں نے تقریباہر معروف صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے اصل جوہر قصیدہ اور ہجونگاری میں نظر آتے ہیں۔امیر مینائیؔ نے بھی ان کی مضمون آفرینی اور مدح وقدح میں شعرائے سلف کے دوش بدوش چلنے کوسراہاہے۔لکھتے ہیں:

''بڑے مضمون آفریں، بڑے صاحب ذوق تھے۔تعلّی مضامین سے سرزمین سخن کو آسمان بنایا۔مدح وقدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا'' ۶

اس دیوان میں ص 4 سے لیکر 43 تک قصائد ہیں جن میں نعتیہ اور مدحیہ قصائد ہیں اور مدحیہ قصائد کی تعداد آٹھ ہے۔ان میں بعض کافی طویل ہیں اور ساتھ ہی سوداؔ کا ان میں تتبع بھی ملتاہے۔غفلتؔ کے قصائد بے حد پرمغز اور سحر انگیز ہیں اس لیے ان کو ایک کامیاب قصیدہ گو کہنا بے جانہ ہوگا۔مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''درقصائد ومثنوی دادمعنی بندی می دہد'' ۷

غفلت کو قصیدہ اور ہجو سے طبعی مناسبت تھی۔انہوں نے قصیدہ کے جملہ اجزاءیعنی تعلّی خود،ممدوح کی اور اس کے فیل کی مدح،گھوڑے وغیرہ کے اوصاف کا بیان اور دعا کو بخوبی نظم کیاہے۔مثلا

تعلّی خود

ہوں وہ روشن طبع گر ہو مجھ سے روکش آفتاب
چرخ نظروں سے گرا دے صورت تیر شہاب
ماہ کا دوران سر خورشید کا رعشہ ہو دور
آئے گر سوئے طبابت اپنی رائے باصواب
گرم جولاں ہے جہاں میرا سمند فکر واں
اڑتی ہے گرد شکست رنگ ماہ و آفتاب

مدح

ہوئی تری کف زر بخش سے جو زر ریزی

زباں ناطقہ ہو کیوں نہ اس کے وصف میں لال
کہ آشیانہ کنجشک میں بجز مقیش
جو ڈھونڈھیے تو نہ تنکا ملے برائے خلال

جس طرح سودا نے خاقانی کے قصیدے پر اردو میں ایک مشہور نعتیہ قصیدہ (ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی) کہا تھا اسی طرح غفلت نے بھی دونوں کی اتباع کرتے ہوئے ایک نعتیہ قصیدہ اسی زمین میں کہا ہے۔

تشبیب

سلوک آفاق میں بے جوہروں سے کون کرتا ہے
نہیں دیکھا کہ دے شمشیر چوبیں کو کوئی پانی
کروں گر پیروی الیاس کی وہ راہ گم کر دے
جو بیٹھوں نوح کی کشتی میں تو ہو جائے طوفانی
فغاں ہے بخت بد سے ایک تو بیمار خوباں ہوں
بتاتے ہیں اطبائے زمانہ اس پہ خوبانی

مدح

اگر یہ جانتا شیطاں کہ ہے آدم میں نور اس کا
جھکاتا بہر سجدہ سب سے اول اپنی پیشانی
اگر اُس کی زباں سے شکل عیسی حرف قم نکلے
عدم سے آئیں سب غیر شریک ذات ربانی
ترا کیا عظم شاں کہیے بیاں جب تیری امت سے
کہے کوئی انا الحق اور بولے کوئی سبحانی

غفلتؔ نے قدما کے رنگ میں کئی ہجویہ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور وہ اس صنف سخن میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگر غفلتؔ کی ہجویات کا سوداؔ اور قائمؔ کی ہجویات سے موازنہ کیا جائے تو تقریباً غفلت کی ہجویات بھی سودا اور قائم کی ہجویات کے ہم پلہ نظر آئیں گی۔ قائمؔ کی مثنوی "شدت سرما'' کے جواب میں غلفت نے بھی اسی عنوان سے مثنوی لکھی۔

مثنوی در بیان شدت سرما:

برد سے گم ہیں سماعت کے بھی ہوش
دیکھیے اب جس کو ہے پنبہ بگوش
اپنے اپنے گھر میں اب پیروں جواں
آگ روشن کر کے بیٹھے غنچہ ساں
شمع سے ہے انس پروانہ غلط
سینکنے کو ہاتھ آتا ہے فقط
بسکہ ہے آتش سے ہر طائر کو ساز
پشہ اور جگنو میں کیا ہو امتیاز
آگ پر گرتا ہے عالم اس طرح
شمع پر دوڑے پتنگا جس طرح
الخ

مثنوی در بیاں شدت وبا:

کثرت امراض ہے اب اس قدر
آسماں کو ہو گیا دوران سر
ہے کوئی بیمار بالائے سپہر
صبح جو قارورہ لے جاتا ہے مہر
قطرہ شبنم نہیں وقت سحر
پتی اچھلی ہے گلوں کے جسم پر
کانپتا جو مہر پر انوار ہے
آگ پانی کا اسے آزار ہے
ہے عدم میں بھی مگر رنج و محن
سر سے باندھے غنچہ آتا ہے کفن
بحر میں گر دام مارے صید گیر

جائے ماہی مردہ ہو جائے اسیر۔۔ الخ

قصیدہ اور ہجو دونوں میں مبالغہ کو حسن سمجھا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی ہر قسم کے علوم سے ضرورت کے مطابق واقفیت بھی ضروری ہے۔ نیز خیال کی بلندی، قادرالکلامی اور پرزور اظہار بیان کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ مندرجہ بالا مختصر نمونہ کلام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غفلتؔ بھی اس ضمن میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

غزلیات:

غفلتؔ کے اصل شاعرانہ جوہر اگرچہ قصیدہ و ہجو نگاری میں کھل کر سامنے آتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سلطنت شعر وسخن میں غزل گوئی میں بھی کسی ہم عصر استاد شاعر سے کم نظر نہیں آتے۔

غفلتؔ نے جب ہوش سنبھالا تو قائمؔ زندہ تھے۔اور اس وقت علاقہ روہیل کھنڈ میں قائم کا ہی رنگ سخن مقبول و معروف تھا۔شوقؔ بھی اس وقت تک اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔غفلتؔ نے جب شاعری شروع کی تو قائمؔ کی وفات ہو چکی تھی اور اس وقت روہیل کھنڈ میں شوقؔ کا دور دورہ تھا۔شوق کو ایک جلیل القدر استاد اور قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا تو غفلتؔ نے بھی شوقؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔اب ظاہر ہے کہ غفلتؔ نے اپنی ابتدائی شاعری میں روہیل کھنڈ کے موجودہ طرز سخن کو ہی اختیار کیا ہوگا اور اسی رنگ میں غزلیں کہی ہوں گی۔جس کی جھلک ہمیں غفلتؔ کے کلام میں صاف دیکھنے کو ملتی ہے۔لیکن 1794ء کے بعد اس وقت کی موجودہ ریاست روہیل کھنڈ (ریاست رام پور) کا سیاسی رابطہ دہلی کے بجائے لکھنؤ سے قائم ہو چکا تھا۔کیونکہ نواب احمد علی خاں کو 1209ھ/ 1794ء میں آصف الدولہ وزیر اودھ نے ہی مسند نشیں کیا تھا۔جس کی وجہ سے روہیل کھنڈ کے شعراء کی لکھنؤ میں آمدورفت ہونے لگی۔آمدورفت کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ نواب نصراللہ خاں کے انتقال کے بعد جب نواب احمد علی خاں رندؔ نے حکومت کے اختیارات سنبھالے تو حالات روز بروز خراب ہوتے گئے۔کیوں کہ ان کے والد نواب محمد علی خاں کو ان کی بعض باتوں سے ناخوش ہو کر قتل کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے نواب احمد علی خاں لوگوں سے خائف رہتے تھے۔چنانچہ چھ ماہ جنگلوں میں شکار کھیلتے اور چھ ماہ محلسرا میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے۔بیگمات اور طوائفوں کی موجودگی میں انہیں باہر کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔انتظام حکومت نااہل چلاتے تھے حالات کی خرابی اور معاشی بدحالی نیز آفات ارضی وسماوی کی بنا پر ہزاروں لوگوں اور شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا۔نواب صاحب خود شاعر تھے لیکن شاعروں کو باریاب ہونے کا موقع ہی کب ملتا تھا۔جس کی وجہ سے شعرائے روہیل کھنڈ کا لکھنؤ کے مشاعروں اور ادبی ماحول سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔غفلتؔ نے بھی کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کیا تھا۔جہاں ان کی مصحفیؔ سے ملاقاتیں بھی رہیں اور ساتھ ہی مشاعروں میں شرکت بھی۔

جس کی بنا پر لکھنؤ والوں نے ان کو کافی سراہا۔غفلتؔ ان کی ان صحبتوں اور قدر دانیوں کو ہمیشہ یاد کرتے رہے جس کا اشارہ ہمیں ان کے اشعار میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلا

غفلت کی قدر ہر گز ہو وے نہ رام پور میں
آوے کوئی سخنور جب تک نہ لکھنؤ سے

گو رام پور میں تری شہرت نہیں بجا ہے
نور چراغ غفلت زیر چراغ کیوں ہو

اسی وجہ سے غفلت نے بھی لکھنؤ کی بعض باتوں کو قبول کیا اور وہاں کے طرز سخن کو بھی اپنایا۔ مثلاً طویل غزلیں کہنا اور استادانہ شان دکھانے کی غرض سے دوغزلہ اور سہ غزلہ کہنا۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غفلتؔ قائمؔ اور دیگر شعرائے دہلی کی صاف طور پر پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کی غزلیں سوز و گداز اور اثر انگیزی و اثر آفرینی سے خالی نظر نہیں آتیں۔

غفلتؔ کی غزلوں میں آورد کم آمد کا انداز زیادہ پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے بھی صاف و شستہ دکھائی دیتی ہیں۔ جا بجا جوش و جذبے اور بے ساختگی کی شکلیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں دردِ دل بھی صاف طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے اسی وجہ سے اظہار داخلیت میں بھی وہ اپنا مقام الگ ہی رکھتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

لوہو کے چند قطرے پھر آنکھوں میں آ گئے
سمجھا تھا میں کہ زخم مرے دل کا بھر گیا

کوہ و بیاباں پر ہے ماتم آج یہ کس دیوانے کا
چین بچین ہے ریگ رواں، دامن ہے پھٹا ویرانے کا

پوچھے ہے خلق مجھ سے مری ذات کیا کہوں
حسرت کہوں کہ یاس کہ ہیہات کیا کہوں

میں تو تجھ کو منع کروں گا حسن پرستی سے غفلت
خواہ تو سمجھے دشمن جانی خواہ مجھے ہمدم سمجھے

آہ جب کوئی خریدار معانی نہ رہا
گرم غفلت کی سخن گوئی کا بازار ہوا

شعرائے روہیل کھنڈ کا عام وصف دل پر لگے زخم وداغ سے پیدا ہونے والے درد کا اظہار کرنا تھا جو ہر ایک کے یہاں مہر کی صورت تاباں نظر آتا ہے البتہ درد کی کیفیت اور شدت کا اظہار جداگانہ طور پر پایا جاتا ہے۔لہٰذا غفلت نے بھی درد وکرب کو کچھ الگ انداز میں پیش کیا ہے۔چند اشعار دیکھیے :

درد اٹھا دل میں آج دیکھیے کب تک رہے
پھر یہ مکدر مزاج دیکھیے کب تک رہے

گئے وہ دن کہ بہہ جاتے تھے پل میں چشم سے دریا
جو اب ہم برسوں روتے ہیں تو اک آنسو نکلتا ہے

سوزن سے ہو سکا نہ رفو اپنے زخم کا
پایا ہے کس نے فایدہ اپنے کمال کا

غفلت نے دنیا کی ناپائیداری، بے ثباتی اور فنائیت کو بھی اپنے یہاں کافی جگہ دی ہے۔مثلا

ایک دم ٹھہرا نہ اس آئینہ خانے میں کوئی
عکس کی صورت ادھر آیا ادھر جاتا رہا

غفلت کا پختہ رنگ سخن عشق مجازی کی الجھن ہے ان کے یہاں محبوب کا دیا ہوا کرب ہر طرح شعری دریچوں سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔سودائے عشق، محبت کی تڑپ اور ہجر وفراق کے صدمے جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ عشق مجازی کا اظہار مختلف پہلوؤں میں کس طرح کرتے ہیں اس پر چند اشعار دیکھیے :

حسن:

ترے چہرے کے آگے شمع کس شب کٹ نہیں جاتی
یہ حیرت ہے کہ آئینے کی چھاتی پھٹ نہیں جاتی
پسینے سے سوا رنگ اس کے چہرے کا چمکتا ہے
تعجب ہے کہ شعلہ آب سے دونا بھڑکتا ہے

رقابت:

غیر ہم آغوش یار دیکھیے کب تک رہے
رشک مرا ہم کنار دیکھیے کب تک رہے

بےقراری:

کون سی شعلہ کی شکل اپنے خیالات میں تھی
شمع آسا جو یہ جاں رات صد آفات میں تھی

درد:

یہ حالت ہو رہی ہے آج تیرے غم میں غفلت کی
گہے روتا ہے گہہ ہنستا ہے گاہے سر پٹکتا ہے

غفلتؔ مزاجی اعتبار سے سوداؔ ثانی تھے جس کا ثبوت ان کے قصائد اور ہجویات میں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن انہوں نے قصائد اور غزلوں کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھ کر غزلوں میں بھی اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا۔ جس کی وجہ سے وہ آج بھی تاریخ ادب کے صفحات میں زندہ وجاوید ہیں۔

****

حوالہ جات

1۔انتخاب یادگار ازامیر مینائی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 266

2۔تذکرہ کاملان رامپور از احمد علی خاں شوق،لبرٹی آرٹس پریس مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پٹودی ہاؤس دریا گنج (نئی دہلی) 1986،ص 8

3۔انتخاب یادگار ازامیر مینائی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 266

4۔ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985،ص 257

5۔انتخاب یادگار ازامیر مینائی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1982،ص 266

6۔ایضاً،265

7۔ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی،اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1985،ص 257

***

بیمارؔ

بیمار کا نام شیخ علی بخش تھا اور بیمار تخلص اور والد کا نام شیخ غلام علی تھا۔ بیمار 1204ھ مطابق 1790ء میں آنولہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بیمار کی جائے پیدائش کے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کی الگ الگ رائے ہے۔

حسن علی خاں لکھتے ہیں: ''شیخ علی بخش سنبھل مراد آباد کے مشہور شاعر'' ١

امیر مینائی لکھتے ہیں: ''شیخ علی بخش ابن شیخ غلام علی متوطن شہر بانس بریلی'' ٢

نورالحسن خاں لکھتے ہیں: ''شیخ علی بخش باشندہ آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی'' ٣

لالہ سری رام بھی امیر مینائی کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''شیخ علی بخش بیمار ولد شیخ غلام علی ساکن شہر بانس بریلی'' ٤

بیمار کے خاندانی حالات پردہ خفا میں ہونے کی بنا پر ان کی جائے پیدائش کا تعین یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا البتہ ہو سکتا ہے ان کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ایک روہیلوں کے دور اقتدار میں سنبھل سے آنولہ آ کر بس گیا ہو۔ اور حسن علی خاں کی نظر کسی ایسی تحریر پر پڑی ہو جس میں یہ اشارہ دیا گیا ہو کہ بیمار کے آباؤ اجداد شہر سنبھل کے رہنے والے تھے جس کی وجہ سے حسن علی خاں نے انہیں سنبھل کا باشندہ بتا دیا۔ لیکن اس معاملہ میں امیر مینائی کا قول زیادہ قابل قبول ہے کیوں کہ ان کا تعلق بمقابل دوسروں کے بیمار سے سب سے زیادہ تھا اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بیمار ضلع بریلی کی تحصیل بقول نور الحسن خاں آنولہ میں پیدا ہوئے۔ اگر بیمار کے آباؤ اجداد نے سنبھل سے بریلی ہجرت کی ہوگی تو بریلی میں آنولہ ہی میں سکونت اختیار کی ہوگی کیوں کہ آنولہ اس وقت بریلی میں دار الریاست ہونے کی بنا پر مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

بیمار کی سن ولادت کی طرف کسی بھی تذکرہ نگار نے کوئی اشارہ نہیں کیا البتہ امیر مینائی کے اس قول جس میں انہوں نے تاریخ وفات کا ذکر کیا ہے، کے ذریعے ان کی سن ولادت نکالی جا سکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''سڑسٹھ برس کی عمر ہوئی، چوبیس ربیع الاول کو بارہ سو اکہتر ہجری میں رحلت کی اس دار فانی سے دار باقی کی طرف رخصت کی'' ۵

اب جبکہ بیمار نے سڑسٹھ سال کی عمر پائی اور 1271ھ میں انتقال کیا تو اس حساب سے ان کی سن ولادت 1204ھ مطابق 1290ء ہوئی۔

بیمارؔ ابتدائی تعلیم آنولہ میں حاصل کرنے کے بعد جب سن شعور کو پہنچے تو لکھنؤ چلے گئے۔ شاعری کا شوق اوائل عمری سے ہی تھا چنانچہ جب لکھنؤ پہنچے تو جعفر علی حسرتؔ اور میرؔ و مرزاؔ کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں مصحفیؔ کا طوطی بول رہا تھا لہذا بیمارؔ ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ مصحفیؔ کے انتقال کے بعد بھی بیمار لکھنؤ میں ہی رہتے رہے۔

1840 میں جب نواب سعید خاں رامپور کے تخت پر متمکن ہوئے تو نواب موصوف صاحب نے حکیم سعادت علی خاں رئیس آنولہ کو رامپور بلا کر فوج کا جنرل مقرر کر دیا۔ حکیم سعادت اور بیمار کے درمیان خصوصی تعلقات تھے چنانچہ حکیم صاحب نے بیمارؔ کو رامپور بلا کر دربار سے باریاب کرا دیا۔

بیمار جب رامپور پہنچے تو وہاں اخون زادہ احمد خاں غفلتؔ کا دور دورہ تھا اور غفلتؔ و مصحفیؔ کے درمیان اچھے مراسم تھے لہذا بیمارؔ نے غفلتؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔ امیر مینائیؔ لکھتے ہیں:

''شاگرد میاں مصحفی مرد خوش فکر و خوش مذاق حسن کلام سے مشہور آفاق تھے جب اس دار الریاست میں آ کر سرکار کے ملازموں میں ہوئے یہاں احمد خان غفلت کا دور دورہ تھا مصلحتا ان کے شاگردوں میں شامل ہوئے'' ٦

غفلتؔ کا انتقال 1843ء میں ہوا چنانچہ غفلتؔ اور بیمارؔ کا تعلق محض تین سال تک ہی رہا۔

بیمارؔ استاذ شاعر کی حیثیت رکھتے تھے غفلتؔ کے انتقال کے بعد بیمارؔ کی طرح رامپور میں کوئی استاد نہ تھا اس لیے کافی شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ بیمار کے تلامذہ میں مشہور زمانہ شاعر نظامؔ رامپوری، میر احمد علی رساؔ اور صاحبزادہ مہدی علی خاں وغیرہ ہیں۔ امیر مینائیؔ انتخاب یادگار میں ان تلامذہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''سید نظام شاہ۔۔۔ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر ناظم فردوس مکاں انار اللہ برہانہ کے شاگرد رشید ہیں شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں۔'' ۷

''میر احمد علی رسا۔۔۔مزاج وارستہ , طبیعت رنگین , سخن شناس , سخن آفرین، شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد ہیں۔'' 8

''صاحبزادہ مہدی علی خاں۔۔۔پینسٹھ برس کی عمر شیخ علی بخش بیمار سے تلمذ ہے۔'' 9

بیمارؔ نے رامپور آنے کے بعد پھر اور کہیں کا سفر نہیں کیا۔آخری عمر تک یہیں رہے اور 24 ربیع الاول 1271ھ مطابق 1854ء میں یہیں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

تصانیف:

بیمار کی دو تصانیف ہیں ایک طلسم بیضا اور دوسری دیوان بیمار۔

1۔طلسم بیضا:

داستان بوستان خیال میں پانچ بڑے طلسمات ہیں جن میں سے ایک طلسم بیضا ہے۔بیمار نے اسی طلسم بیضا کا نواب محمد سعید خاں کی فرمائش پر اردو میں منثور ترجمہ کیا تھا۔

طلسم بیضا کا نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔یہ مخطوطہ پچپن جزو اور پانچ اورق پر مشتمل ہے۔اس نسخہ کی نقل بیمار کے انتقال کے تقریبا تین ماہ بعد 1271ھ مطابق 4 مارچ 1854ء میں مکمل ہوئی۔

2۔دیوان بیمار:

اس دیوان کا نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔یہ نسخہ 56 صفحات پر مشتمل ہے۔بعض صفحات کورے ہیں،بعض صفحات پر چند اشعار ہیں اور بعض پر صرف مقطعے ہیں۔اس کے باوجود دیوان میں ترتیب اور سلیقہ ہے۔

امیر مینائیؔ لکھتے ہیں:

''کلام بہت زیادہ تھا مگر تلف ہوگیا'' 10

اس کی مزید تائید صاحب طور کلیم کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

''صاحب زبان اور استاد فن ہیں، کتنے دواوین غزلیات و قصائد مرتب کر کے ضائع کر دیے۔'' 11

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل دیوان ضائع ہوجانے کے بعد بیمار نے اپنی یادداشت کے سہارے اس دیوان کو مرتب کیا۔جو مکمل غزل یاد رہی اس کو مکمل نقل کر دیا اور جس کے چند اشعار یاد تھے اس کے چند اشعار ہی نقل کر دیے۔اس دیوان میں غزلیات کے علاوہ دو خمسے،ایک نا تمام قصیدہ اور چھ رباعیات ہیں۔پہلا خمسہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں

ہے۔ یہ مصرع 'دل وجان باوفدایت چہ عجب خوش لقبی' فارسی میں ہے۔ دوسرا خمسہ رسا رامپوری کی غزل 'ہاں وہ فرماتے ہیں اک بارتو سو بارنہیں' پر اردو میں ہے۔ ناتمام قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

دم سحر جو در یار سے کھلی زنجیر
تو بار یاب ہوا میں بھی یہ سنی تقریر

اٹھارھویں صدی پرختم ہونے والا روہیل کھنڈ کی شعری تاریخ کا پہلا دور اردو غزل میں نہ صرف ادبیت کا حامل تھا بلکہ شعریت، وحدانیت اور جاذبیت سے بھی معمور تھا مثلاً محبت خان محبت کی غزل ہی دیکھ لیں اس میں جہاں ادبی وقار ہے تو وہیں ساتھ میں داخلی کیفیات کی اثر انگیزی اور طرز بیان کی دلکشی بھی موجود ہے۔ روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد جب یہاں کے شعرا پر لکھنؤ کے اثرات قائم ہوئے تو یہاں کی کیفیاتی شاعری رفتہ رفتہ رخصت ہوگئی۔

بیمار کے ابتدائی تعلیم وتربیت کا دور بھی غزل کے فطری رجحانات سے وابستہ رہا تھا۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں انھوں نے خارجی شاعری کو غزل میں راہ دی تھی اور یقیناً بیمار کی غزل میں بگاڑ کی صورت حد درجہ پیدا نہیں ہوئی تھی لہٰذا ان کی مضمون پسندی نہ تو معمابنی اور نہ معشوق کی موہوم کمر سے متصف ہونے تک پہنچی۔ شاعری میں زمین کا انتخاب کرنا بھی گوارا ہے اور الفاظ بھی ادبی بھرم کے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں، سخن میں وصل کے بجائے احساس وآرزوئے وصل کی جھلک نظر آتی ہے اسی طرح بوسہ لب ودہاں کے تذکرے کے بجائے بوسہ لب ودہاں کی ہلکی سی دل فریب مٹھاس ملتی ہے۔ ان کی لکھنوی غزلوں میں اپنے مرکز سے دور ہونے کے باوجود ادبی سلیقہ ہے، ان میں پھول کی پتی کی طرح نزاکت نہ سہی لیکن سروقد کی عظمت ضرور ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

پھیرتے رہتے ہو کیوں دز و حنا کے سر پہ ہاتھ
بندہ پرور دل ہمارا آپ سے پکڑا گیا

سنی پھبتی گل بادام کی جب چشم میگوں پر
قلم نگرس ہوئے کرنے کو صاد اس تازہ مضموں پر
سیاہی سرخی رنگ حنا میں ہو گئی پیدا
شگون نیک ہے باندھو کمر عاشق کے شنجوں پر
عرس قیس ہے صحرا میں جو کثرت سے جگنو کی

گماں سرو چراغاں کا ہے ہر ایک بید مجنوں پر

طول سے لپٹی ہے ان کی زلف پیچاں پانوں میں
بیڑیاں پہنے ہے گویا ماہ کنعاں پانوں میں
کچھ بھی ہے سر پانوں یارب ظالموں کے ظلم کا
ملتے ہیں جائے فنا خون شہیداں پانوں میں

واہ رے تاثیر تیرے عشق عالم سوز کی
خاصہ اکسیر کا پیدا ہوا ہر خاک میں
مرگ مجنوں میں جو لیلی نے بچھایا بوریا
بن گیا بید مجنوں نقش بستر خاک میں
روح بلبل کر گئی پرواز آتے ہی خزاں
کچھ ہوا میں اڑتے ہیں کچھ مل گئے پر خاک میں

بیمار کے یہاں سچی اور خالص غزل کے بے شمار نمونے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ میں رہ کر بھی لکھنوی رنگ سخن کو حد درجہ اختیار نہیں کیا بلکہ مصحفی اور میر کے نقش قدم پر چل کر اپنا منفرد لہجہ پیش کیا جس میں لطف زباں کے ساتھ غضب کا سوز و گداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ چنانچہ حسن علی خاں ان کی قوت بیان اور لطف زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے خیال کی بلندی گمان سے بالا ہے۔ قوت بیان اور لطف زبان اگر چہ میر اور مصحفی سے بہتر نہیں لیکن کم بھی نہیں۔ ہاں زمانہ کے لحاظ سے سبقت اور زبان کی جدت امر دیگر ہے۔'' ۱۲؎

جب شاعر میں شعر کی فکری عظمت کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے کلام میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نمونے بیمار کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

تا آسماں پہنچ کے ہوئی آہ سرنگوں

یا رب ہو خیر فوج الم کا نشاں گرا

بھولی جو ایک دم کو گریباں دری ہمیں
وحشت نے یاد دامن صحرا دلا دیا
قربان جایئے ترے شوق ظہور کے
دے کر فریب خاک میں ہم کو ملا دیا

وہ بارہا مرے رونے پہ ہنستے آئے ہیں
معاملہ ہے بہم برق و ابر تر کا سا

چشم جاناں پر گماں گزرا ہے مجھے دو صاد کا
قامت موزوں ہے یا مصرع کسی استاد کا

یہ اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ بیمار کی فکر کا معیار کتنا بلند تھا اور ساتھ ہی انہوں نے سابقین کے طرز کو اپنایا نہیں بلکہ اپنے عہد کی بت گری اور صنم پرستی کی فضا میں شیشہ گری کا کام کیا۔

بیمار کی غزلیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قیام لکھنؤ کے دوران صرف خارجی شاعری سے سروکار نہیں رکھا بلکہ اپنے فطری رنگ میں بھی شاعری کرتے رہے۔ فطری شاعری میں ترک و اختیار کو دخل نہیں ہوتا البتہ زندگی کے حادثات و واقعات شاعر کے دل پر نئے نئے نقش بناتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی تہذیب مسلسل کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اور اس تہذیب مسلسل کے عمل میں ارمانوں کی پسپائی، تمناؤں کی شکست اور نامرادی وغیرہ ہوتی ہے۔ بیمار نے فطرتا جو محسوس کیا اور جو ان کی داخلی کیفیت تھی اس کو اشعار کا جامہ پہنا دیا۔ چند مثالیں دیکھیے:

یار سے سوز جگر کا ہم گلہ کرنے کو تھے
رہ گئی عزت کہ دل میں درد پیدا ہو گیا

شام سے تا صبح فرقت صبح سے تا شام ہجر

ہم چلے کیا کیا نہ لطف زندگانی دیکھ کر

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو
کیے غم سے خالی مکاں کیسے کیسے

ہزار سینے میں سرخ چھالے جگر میں کتنے ہیں داغ کالے
رواں کیے آنسوؤں نے نالے یہ حال یا رب نہ ہو کسی کا

رنج دنیا میں بہت پاتے ہیں ہم
اس محلے سے اٹھے جاتے ہیں ہم

کیا سفر کا ارادہ جو بزم جاناں سے
کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے

اے اجل شام ہجر آ پہنچی
اب تجھے انتظار ہے کس کا

بیمار اور اس کے سوا کچھ نہیں خبر
الجھا ہوا ہوں حادثہ ناگہاں کے ساتھ

بیمآر کی غزلوں میں شوخی بھی پائی جاتی ہے لیکن حد درجہ نہیں۔ وہ اپنے اشعار میں بس اتنی ہی شوخی استعمال کرتے ہیں کہ اسے معیوب نہ سمجھا جائے اور مہذب افراد بھی اس کی گہرائی و گیرائی سے محظوظ ہو سکیں بلفظ دیگر ان کی اشعار کو سفلے پن سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اشعار دیکھیے:

جس کسی نے دل دیا ان کو چھپے چوری دیا

ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

جب پوچھتا ہوں کس نے مرا دل چرا لیا
کہتے ہیں وہ بچائے خدا اتہام سے

وہ سن کر حال میرا کچھ نہ بولے
مگر ہر بات پر گردن ہلا دی

وہ رند ہوں جو روٹھ کے میخانے سے اٹھا
پاؤں پہ ہاتھ باندھ کے پر مغاں گرا

بیمار میکشوں کے جنازہ ہے دوش پر
جاتے ہیں گھر خدا کے بڑے اہتمام سے

کل تھے رندی کے مجتہد بیمار
آج دعویٰ ہے پارسائی کا

بندہ پرور کو ہے کیوں ملنے سے بیمار کے عار
ذی لیاقت بھی ہے دانا بھی ہے مشہور بھی ہے

بیمارؔ کے ان اشعار میں حسن معنی بھی ہے اور حسن بیان بھی، شعریت بھی ہے اور وجدان بھی۔ مختصر یہ کہ بیمار کی غزلیات اردو شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہیں جس میں غیر معمولی ادبی پختگی، سلیقہ مندی اور کشش و جاذبیت ملتی ہے۔ الغرض بیمار اپنے عہد کے ایک طبع زاد شاعر تھے۔

****

حوالہ جات

1۔ بزم سخن تلخیص از حسن علی خاں، مترجم و مرتب عطا کاکوی، عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج (پٹنہ) تاریخ اشاعت ستمبر 1968، ص38

2۔ انتخاب یادگار از امیر مینائی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1972، ص81

3۔ طور کلیم تلخیص از نور الحسن خاں، مترجم و مرتب عطا کاکوی، عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج (پٹنہ) تاریخ اشاعت ستمبر 1968، ص39

4۔ خم خانہ جاوید از لالہ سری رام، مخزن پریس (دہلی) 1908، ص684

5۔ انتخاب یادگار از امیر مینائی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) پہلا اکیڈمی ایڈیشن 1972، ص82

6۔ ایضاً، ص81

7۔ ایضاً، ص386

8۔ ایضًا، ص146

9۔ ایضًا، ص369

10۔ ایضًا، ص82

11۔ طور کلیم تلخیص از نور الحسن خاں، مترجم و مرتب عطا کاکوی، عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج (پٹنہ) تاریخ اشاعت ستمبر 1968، ص39

12۔ بزم سخن تلخیص از حسن علی خاں، مترجم و مرتب عطا کاکوی، عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج (پٹنہ) تاریخ اشاعت ستمبر 1968، ص38، 39

***

نظاؔم رامپوری

نظاؔم کا نام سید نظام شاہ اور تخلص نظاؔم تھا۔ نظام کے مورث اعلیٰ سید عبداللہ شاہ روہیلوں کے پیر تھے اور روہیلوں کے ہمراہ قبائلی علاقے یعنی صوبہ سرحد سے روہیل کھنڈ آئے تھے۔ جب نواب فیض اللہ خاں نے رامپور شہر آباد کیا تو سید محمد شاہ ولد سید عبداللہ شاہ رامپور آ گئے۔ اور یہیں محلّہ گھیر سخی میں 1239ھ مطابق 1823ء میں نظام کی پیدائش ہوئی۔ لیکن کلب علی فائق نے کلیات نظام کے مقدمہ میں نظام کی سن ولادت 1819ء بتائی ہے لکھتے ہیں:

''نظام کی ولادت محلّہ گھیر سخی میں 1819ء کے لگ بھگ ہوئی۔'' [1]

نظاؔم کی تاریخ پیدائش سوائے مقدمہ کلیات نظام کے کہیں موجود نہ ہونے کی بنا پر ان کی صحیح سن ولادت امیر مینائی کے اس قول سے نکالی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ امیر میناؔئی نے نظام کا زمانہ دیکھا بھی تھا اور ان کے ساتھ مراسم بھی تھے۔ اس لیے امیر میناؔئی کے اس قول کو ترجیح دی جا سکتی ہے لکھتے ہیں:

''پچاس برس کی عمر ہوئی، شعبان کی پچیسویں تاریخ بارہ سو نواسی ہجری میں قضاء کی۔'' [2]

اب جب کہ امیر میناؔئی نے نظاؔم کی وفات کے وقت ان کی عمر پچاس سال بتائی ہے تو اس حساب سے ان کی سن ولادت 1823ء نکلتی ہے۔

نظاؔم نے ابتدائی تعلیم غالباً محلّہ کے کسی عالم سے حاصل کی اس کے بعد میاں احمد علی شاہ احمد کی شاگردی میں آ گئے اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ جب نظاؔم کی عمر بیس یا پچیس سال ہوئی تو وہ رامپور کی فوج کے رسالہ سواروں میں ملازم ہو گئے۔ یہ ملازمت نظام کو وراثت میں ملی تھی۔

نظاؔم نے تقریباً چھبیس سال کی عمر میں سید امام علی کی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کیا جن سے نو اولادیں پیدا ہوئیں لیکن حیات صرف آخری اولاد قیصر شاہ ہی رہ پائے۔ جس کا ذکر نظام نے خود اپنے ایک قصیدہ (جو کلب علی خاں کی

تعریف میں کہا تھا) میں کیا ہے۔اس قصیدہ میں اپنی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں اور بیدادِ اجل کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
فرزند جو ہوا مرا دو تین سال کا
ہاتھوں ہی ہاتھوں لے لیا اس کو بڑھا کے ہاتھ
آٹھوں کے رنج ایسے سہے ہیں کہ کیا کہوں
کوٹا ہے پھروں سینے کو کوبہ بنا کے ھاتھ
ایسے پڑے ہیں صرف تولد کے موت کے
رہنے کا بھی مکان بکا میرزا کے ہاتھ
کچھ گاؤں کے بسے تھے وہ پہلے ہی بک گئے
خالی بھی ہوگیا زر قیمت اٹھا کے ہاتھ
اب ایک ہے کہ دودھ میسر نہیں اسے
کہتا ہے کچھ اشاروں سے ہر دم اٹھا کے ہاتھ

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظاؔم کے بچے دو دو تین تین سال کے ہوکر مرتے رہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی اور معاشی طور پر بہت زیادہ کمزور ہو گئے یہاں تک کہ گاؤں کا مکان بھی میرزا کے ہاتھوں فروخت کرنا پڑا۔موجودہ معاشی حالات کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اب نویں بچے کو دودھ تک میسر نہیں۔ان کی یہ حالت بتاتی ہے کہ ان کی قدیمی تنخواہ ماہانہ دس رپے رہی ہوگی۔اضافے کے بعد بھی انہیں تیس رپے سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔نوابین رامپور مقامی اربابِ فن کو صرف زبانی نوازتے تھے لیکن پیٹ سے بھوکا رکھتے تھے۔اس کی بیشمار مثالیں رامپور کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ نظاؔم کی رسائی دربار تک ضرور رہی لیکن نوازشات سے ہمیشہ محروم رہے۔

نظاؔم نے تلاش معاش کی غرض سے ایک دفعہ ٹونک کا سفر بھی کیا تھا۔کیونکہ نوابین اور اہل ٹونک کے روہیلوں سے اچھے تعلقات تھے۔لیکن کوئی بات نہ بن پائی تو واپس رامپور چلے آئے۔

نظاؔم کی آخری عمر بہت ہی آسودہ گزری تھی۔کیوں کہ ان کی بیوی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے بیٹے قیصر

شاہ کو لے کر میکے چلی گئیں تھیں جس کی وجہ سے نظام کی زندگی کے آخری دو سال بیٹے اور بیوی کی جدائی میں گزرے۔ نظاؔم کے حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ ان کا مکان تک بک چکا تھا جس کے بعد وہ ممتاز خاص کی حیثیت سے نواب فیض اللہ خاں کے پوتوں اور نواب قاسم علی خاں کے بیٹوں کے مردانے کی کوٹھری میں رہنے لگے تھے۔ نظاؔم کی ساری عمر تنگ دستی میں گزری۔ اپنی تنگ دستی کا ذکر انہوں نے اپنے کلام میں بار بار کیا ہے۔

یاں تو رو دھو کے عمر کاٹی نظام
دیکھیے حال ہو وہاں کیسا

ہم سا بھی نظام اور کوئی ہوگا جہاں میں
محروم تمنا ہی رہے ہائے سدا ہم

ضائع نہیں ہوتی کبھی تدبیر کسی کی
میری سی خدایا نہ ہو تقدیر کسی کی

جو کچھ بھی دست رس ہوتی تو ہم کچھ کھا کے مر جاتے
یہ تنگ آئے ہیں جینے سے یہاں تک تنگ دستی ہے

نظاؔم نے پچاس سال کی عمر پا کر 25 شعبان 1289ھ مطابق 29 اکتوبر 1872ء میں انتقال کیا۔ اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ احمد کے پائیں مزار آسودہ خاک ہوئے۔

نظاؔم نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت نواب احمد علی خاں رنؔد کا دور حکومت چل رہا تھا۔ نواب صاحب بھی ذوق شاعری رکھتے تھے اور تخلص رند تھا۔ ان کے زمانے میں اخون زادہ احمد خاں غفلتؔ، کریم اللہ خاں کرؔم اور حافظ الہ داد طالبؔ وغیرہ داد سخن دے رہے تھے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں رامپور کی شاعری اپنے عروج پر تھی۔ گھر گھر شاعرانہ ماحول تھا۔ حالانکہ اس کے بعد جب امیر مینائیؔ اور داغؔ وغیرہ یہاں آئے تو اس میں اور چار چاند لگ گئے۔ تو اب ایسے شعری ماحول سے نظاؔم اپنے آپ کو کیسے الگ تھلگ رکھ سکتے تھے؟۔ چنانچہ شاعری شروع کر دی اور ابتدا میں اپنے استاد میاں احمد علی شاہ احمدؔ سے اصلاح لی۔ نظام کے پہلے استاد کے حوالہ سے کلب علی فائقؔ لکھتے ہیں:

''ابتدائی اصلاح کس سے لی؟ اس کا فیصلہ دشوار ہے۔ ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں اصلاح میاں احمد علی شاہ احمد تخلص اپنے پیر طریقت سے حاصل کی۔'' [3]

اور امیر مینائی لکھتے ہیں:

''جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خان صاحب بہادر ناظم فردوس مکاں انار اللہ برہانہ کے شاگرد رشید ہیں۔ شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں'' [4]

میاں احمد علی شاہ احمد کے بعد شیخ بیمار کے شاگرد ہوئے اور جب بیمار کا 1854ء میں انتقال ہوا تو آخر میں نواب یوسف ناظم کے شاگرد ہو گئے۔

نظام روہیل کھنڈ کے ممتاز شعرا میں سے ایک ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف شعر گوئی کی بلکہ اپنی استادانہ صلاحیتوں سے بہت سے شعراء کو مستفید بھی کیا۔ ان کی اسی شعر گوئی اور سخن فہمی کی بنا پر کافی نو وارد شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ جن کی تعداد کلب علی فائق نے کلیات نظام کے مقدمہ میں 10 بتائی ہے اور ان شاگردان نظام کا جداگانہ طور پر مختصراً حال بھی لکھا ہے۔

تصانیف:

نظام نے ساری عمر تنگ دستی میں گزاری لیکن وہ اس تہذیب و معاشرہ کے پسندیدہ شاعر رہے۔ ان کے عہد میں رامپور میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ نظام کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں نے ان کے مسودات کو جمع کروا کر ترتیب دیوان کا حکم دیا۔ اس دیوان کا خطی نسخہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ اسی دیوان کو بنیاد بنا کر اور جو کلام بعد میں دستیاب ہوا اسے ملا کر قدرت علی قدرت نے شمس المطابع مراد آباد سے کلیات نظام کی شکل میں شائع کیا۔ خطی نسخہ اور مطبوعہ کلیات کی مدد سے کلب علی خاں فائق نے کلیات نظام کے نام سے ہی ایک نیا کلیات مرتب کیا جو مجلس ترقی ادب لاہور سے 1966ء میں شائع ہوا۔

اس کلیات کی بعض غزلوں میں تین تین اور بعض میں دو دو مقطعے ملتے ہیں۔ مثلاً غزل نمبر 211 میں تین مقطعے اور اسی طرح غزل نمبر 212 میں بھی دو مقطعے ملتے ہیں۔

کلیات نظام میں قصیدے، قطعات اور سہرے بھی شامل ہیں۔ لیکن نظام بنیادی طور پر غزل اور غزل میں بھی ایسے رنگ سخن کے شاعر ہیں کہ جس نے اس دور میں لکھنؤ اور دہلی سے آنے والے شعرا کو بھی متاثر کیا جن میں داغ، امیر

مینائی اور منیرؔ شکوہ آبادی وغیرہ شامل ہیں۔

نظامؔ نے جب اپنی شاعری کی ابتدا کی تو انہوں نے المیہ شاعری کو اپنا موضوع سخن بنایا یعنی ان کی شاعری میں یاسیت کا رنگ پایا جاتا تھا لیکن جب وہ دربار سے منسلک ہوئے تو انہوں نے مجلسی اور وصالیہ شاعری کا وہ رنگ اختیار کیا جس کو صاحب دربار اور اہل محفل پسند کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی دل کھول کر داد و تحسین سے بھی نوازتے تھے۔ نظامؔ کا یہی جدید رنگ سخن تھا جسے انہوں نے خود حالیہ شعر کا نام دیا تھا۔ مثلا

حالیہ شعر میرے اس شوخ کو سنائے
یوں غیر کی زبان سے میرا پیام نکلا
حالیہ شعر سن کے مرے کہتے ہیں نظام
اب فن شاعری میں تجھے بھی کمال ہے

اس شاعری میں معاملہ بندی اور وصل وفراق کو موضوع سخن بنایا گیا ہے جس میں بدن کی پکار پوری طرح شامل ہے اور ساتھ ہی ابتذال اور کھلا پن بھی نظر آتا ہے۔

نظامؔ کی شاعری وصل باز عاشق کی شاعری ہے۔ اس میں شوخی ولطف تو ہے لیکن تہ داری نہیں۔ معاملہ کی شاعری ہے جس میں محبوب کی اداؤں اور معاملات کو طرح طرح سے بیان کر کے لطف پیدا کیا جاتا ہے۔ رامپور کا سماجی وتہذیبی ماحول جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا۔ انگریزوں کے اقتدار کے بعد ساری سیاسی وفوجی قوت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور بچی کچی ریاستیں صرف کٹھ پتلی کا درجہ رکھتی تھیں اور ان کے زیر سایہ کام کرتی تھیں۔ اسی لیے انگریزوں کی نگرانی و سرپرستی میں کسی حملے کے خوف سے آزاد ہو کر عیش وآرام کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اس عیش پرستی کے تقاضوں نے ایسی ضرورتوں کو جنم دیا جس میں طوائف مرکزی حیثیت رکھتی تھی جس سے بدن کے ساتھ رقص وموسیقی کی ضرورت کو بھی پورا کیا جا سکتا تھا۔ نظام کا محبوب بھی طوائف تھی جس سے پردہ نشیں محبوب کے برخلاف ملا جا سکتا تھا، باتیں کی جا سکتی تھیں اور گھر پر بھی بلایا جا سکتا تھا۔ چند شعر دیکھیے جن سے نظامؔ کے محبوب کی تصویر سامنے آتی ہے۔

وہ جھروکے میں جو آجائے تو اتنا پوچھوں
بستر اپنا پس دیوار کروں یا نہ کروں

تنگ آکے نظام اس کا شب وصل یہ کہنا

خیر آج تو بس میں نرے ہم آئے ہوئے ہیں

نظام آتی ہے اس منہ سے کیا دم بوسہ
وہ کچھ تو پان کی بو اور کچھ شراب کی بو

اس بناوٹ کہ دکھانا ہمیں پھر کیا حاصل
آج کی رات کہاں دیکھیے مہماں ہونگے

اس تہذیبی فضا میں ہر بوالہواس نے عشق پرستی کو شعار بنایا تھا۔طوائف سے عشق و عاشقی کی باتیں،اس کے حسن واداؤں کا بیان،شوخی اور چھیڑ چھاڑ یہی موضوع کلام تھے۔

لکھنؤ کے شعرا نے عشق کو اپنی شاعری سے خارج کر کے حسن کو مرکز و محور بنایا تھا۔نظاؔم کے یہاں بھی حسن کے متعلق وصل کے نقشے پائے جاتے ہیں۔خواہش وصل کا بیان پایا جاتا ہے اور اس بیان میں وہ مزا ہے کہ اہل محفل تخیل و تصور میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔اور اس طرح کی شاعری نظاؔم کے یہاں بھرپور پائی جاتی ہے۔چند اشعار دیکھیے:

یوں اوڑھے لپیٹے رہو، پر منھ تو دکھاؤ
اب وصل میں بھی شرم کا پردا نہیں اٹھتا

جگایا تھا کس نے سحر تک تمھیں
یہ کس کی خطا ہے ادھر دیکھنا

کسی کے ساتھ سونا وصل کی شب یاد آتا ہے
وہ انگڑائی عجب اک ناز سے منہ پھیر کر لینا

پھر بھی اللہ یہ دن مجھ کو دکھائے گا کبھی
اس کا سونا شب وصل اور وہ جگانا میرا

ہائے وہ مجھ سے بگڑ کر اس کا کہنا وصل میں
میں نہ سمجھا تھا کہ ایسا کچھ یہ ہوگا وصل میں
وہ ابھری ابھری چھاتیاں وہ سینہ صاف صاف
دریا میں ہے حباب کہ دریا حباب میں

لپٹ کے وصل کی شب تم جو ساتھ سوئے تھے
بسی ہے جسم میں اب تک مرے جناب کی بو

اب آؤ مل کے سو رہیں تکرار ہو چکی
آنکھوں میں نیند بھی ہے بہت رات کم بھی ہے
وہ تنگ آ کے شب وصل اس کا کہنا ہائے
ستا لو خیر ہمیں اپنی اپنی باری ہے

نظاؔم کی شاعری کا ایک حصہ تو بیان وصل پر مبنی ہے جسے وہ مجلسی ضرورت کے تحت بیان کرتے ہیں لیکن ان کے کلام کا ایک حصہ وہ ہے جس میں محبوب کی اداؤں اور اس کے حسن و جمال کو بیان کیا گیا ہے۔ نظام جب اس رنگ میں شاعری کرتے ہیں تو وہ اپنے اشعار میں اداؤں کے بیان کی ایک ایسی تصویر بناتے ہیں جو دلربا و دلکش ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں سے اداؤں کی تصویر کشی کرنا نظاؔم کو اچھی طرح آتا ہے۔ اس مشکل کام کو نظاؔم نے جذبہ سے ملا کر ایک ایسا منظر ابھارا ہے جو شعر کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

اف وہ دینا زبان کا منھ میں
ہے ابھی تک مرے مزا منھ میں

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے
اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام
منھ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

نظآم کے کلام میں معاملہ بندی اور ادا بندی دونوں میں ادا بندی زیادہ مزے دار، سنسنی خیز، چٹپٹی اور پر اثر نظر آتی ہے۔ معاملات عشق کو جب قطعہ بند اشعار یا مسلسل غزل میں بیان کیا جاتا ہے تو زیادہ پر لطف ہوتے ہیں لیکن نظآم اس کو غزل کے صرف ایک شعر میں بیان کر کے رہ جاتے ہیں اسی لیے وہ لطف واثر سے خالی نظر آتے ہیں۔

نظآم نے بحیثیت زبان داں بھی اچھے اشعار کہے ہیں۔ وہ روزمرہ کی بول چال میں شاعری کرتے ہیں اور ساتھ ہی محاورات کو پوری صحت وصفائی اور سلاست کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں چٹخارہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ شوخیہ باتیں جب محاورات کی گود میں بیٹھ کر سلاست اور تیکھے لہجے کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تو وہ عوام وخواص دونوں کی ہی دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ جس کی مثالیں نظآم کے کلام کافی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

اپنی تو ہوس یہ کہ جو کچھ ہو وہ ابھی ہو
اور لب پہ اُدھر اس کے ادھر کل ہے ادھر آج

یا خدا خیر ہو کیوں دیر ہوئی قاصد کو
مجھ سے تو کہہ کے گیا تھا ابھی آیا ہوکر

ایسی ہوں ہوں کو کون مانے ہے
بولتے کیوں نہیں ہے کیا منہ میں

کہتے ہیں سن کے دوست بھی اب ہے یہ اپنا حال
بس بس سنا سنا یہ کسی اور سے کہو

اس بات کے ملنے کی بھی کچھ پائی گئی بات
قاصد ترے صدقے یہ اگر سچ ہے تو لا ہاتھ

یہ کہنا نظام اب تو سونے دے مجھ کو
کوئی بیٹھے کب تک کمر ٹوٹتی ہے

کچھ اور کہہ لو جو کہنا ہو، میں تو کہتا ہوں
کلام آپ کا اچھا، زبان اچھی ہے

نظام کا اکثر کلام اسی رنگ سخن جس کو ہم وصالیہ شاعری، معاملہ بندی اور ادا نگاری کا نام دے سکتے ہیں، پر منحصر ہے۔ اور یہی رنگ سخن ان کی شاعری کا خاص پہلو تھا۔ جس کی وجہ سے نظام نے مقبولیت حاصل کی اور بعد میں آنے والے شعرا مثلاً داغؔ، امیر مینائیؔ اور منیرؔ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

****

حوالہ جات

1۔ کلیات نظام از نظام شاہ نظام، مرتب کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1965، ص 62
2۔ انتخاب یادگار از امیر مینائی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) طبع اول 1982، ص 386
3۔ کلیات نظام از نظام شاہ نظام، مرتب کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب (لاہور) طبع اول 1965، ص 63
4۔ انتخاب یادگار از امیر مینائی، اتر پردیش اردو اکیڈمی (لکھنؤ) طبع اول 1982، ص 386

***

باب چہارم

روہیل کھنڈ کی شاعری کی ممتاز خصوصیات

روہیل کھنڈ کی شاعری کی ممتاز خصوصیات

دنیائے اردو ادب میں شعرائے ہند کی عرق ریزی اور جانفشانیوں سے کئی دبستان سخن ہندوستان کی سرزمین پر وجود میں آئے۔ جن کی جہاں کچھ متحد المضامین خصوصیات تھیں تو وہیں کچھ دبستان سخن ایسے ہوئے جن کی مختلف المضامین یا انفرادی نوعیتیں زمانے بھر میں مشہور ہوئیں اور انہیں خاصوں کی وجہ سے وہ پہچانے بھی گئے۔ ان میں سے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کافی مقبول و مشہور ہوئے۔

جب دہلی کے حالات خراب ہوئے اور وہاں کا دربار اجڑنا شروع ہوا تو وہاں کے بہت سے شعرا کئی دوسرے مقامات کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہیں کچھ شعرا ریاست روہیل کھنڈ نواب محمد یار خان کے دربار میں بھی جمع ہوئے۔ چونکہ دہلی کو اس وقت علم و ادب کا مرکز سمجھا جاتا تھا، شمالی ہند کے لوگ تہذیب و ثقافت، علم و فن، شعرو شاعری حتی کہ تمام تر علوم کے حصول کے لیے دہلی کی ہی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد جب شہزادوں کا پے در پے قتل ہوا، نادر شاہ کی دہلی میں لوٹ مار ہوئی اور پھر اس کے بعد احمد شاہ درانی کے حملے ہوئے تو ان سب معاملات نے دہلی میں افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا لوگ خوف و ہراس کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے بیچ سے سکون و اطمینان ختم ہو چکا تھا لہٰذا ان بگڑے ہوئے حالات نے جہاں صاحبان اقتدار کو ذہنی و جسمانی طور پر مجروح کیا وہیں دہلی کے علماء و صوفیاء اور شعرا حضرات کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ جس کی وجہ سے ان حضرات نے اس بے سکون زندگی سے نجات پانے کے لیے آرام دہ زندگی کی تلاش میں الگ الگ جگہوں پر ہجرت کی جہاں بھی ان کو سکون و اطمینان کے امکانات نظر آئے۔ اسی دوران کچھ شعرا حضرات روہیل کھنڈ، نواب محمد یار خان کے دربار اور دیگر علاقوں میں بھی جمع ہو ئے۔

ان حضرات میں سب سے بڑا نام قائم چاند پوری کا تھا۔ جب یہ ٹانڈہ آئے تو جس محفل کا آغاز نواب محمد یار

خان نے کیا تھا اس کی شہرت تیزی کے ساتھ گردونواح میں پھیل گئی جس کی وجہ سے علاقہ روہیل کھنڈ کے نومشق ومشاق اوراستادشعرانے ٹانڈہ کارخ کیا۔اور چونکہ قائم ایک استاذ کی حیثیت رکھتے تھےاور علاقہ بھرمیں ان کا طرز سخن جو کہ دہلوی رنگ سخن میں سے ایک ہے، کافی مقبول ومعروف تھا۔لہٰذاان جمع ہونے والے تقریباً تمام ترشعرانے قائمؔ کے طرز سخن کی ہی پیروی کی۔

لیکن جب 1774ء میں شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا تو ریاست روہیل کھنڈ ایک چھوٹے سے علاقے ریاست رامپور میں سمٹ کر رہ گئی۔دہلی کی بربادی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا لہٰذا شجاع الدولہ کے اس حملے کے بعد روہیل کھنڈ کے شعرانے دہلی کارخ نہ کرکے لکھنؤ کارخ کیا۔

چونکہ شجاع الدولہ کا پورے روہیل کھنڈ پر قبضہ ہو چکا تھا لیکن ریاست رامپور کو شجاع الدولہ اور انگریزوں نے نواب فیض اللہ خاں کو معاہدہ لال ڈھنگ کے تحت عطا کیا تھا لہٰذا جب ریاست رامپور مستحکم ہوئی تو ریاست رامپور اور لکھنؤ کے درمیان رابطے قائم ہونا شروع ہوئے جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری پر بھی لکھنوی رنگ سخن کے کچھ کچھ اثرات رونما ہونے لگے۔

لیکن ابھی خاص نمایاں حد تک لکھنوی رنگ سخن کا اثر یہاں کی شاعری پر نہیں پڑا تھا کہ 1794ء میں نواب محمد علی خاں کے قتل کے بعد جب نواب غلام محمد خاں کو مسند نشیں کیا گیا تو آصف الدولہ نے ان کی اس مسند نشینی کو قبول نہیں کیا اور انگریزوں کی مدد سے فوج کشی کر دی جس کے نتیجے میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ قرار پایا کہ نواب غلام محمد خاں مع اپنی اولاد کے تخت چھوڑ کر رامپور سے باہر چلے جائیں۔لہٰذا ان کو معزول کرنے کے بعد نواب محمد علی خاں کے بیٹے نواب احمد علی خاں رندؔ کو مسند نشیں کیا گیا۔اس کے بعد ریاست رامپور میں نوابین لکھنؤ کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا جس کی وجہ سے سیاسی ومعاشی رابطے دہلی کے بجائے لکھنؤ سے زیادہ قائم ہو گئے اور روہیل کھنڈ ولکھنؤ کے شعرا کی ایک دوسرے کے یہاں آمدورفت کافی زیادہ ہونے لگی جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری پر لکھنوی رنگ سخن کا اثر پڑا اور بہت سے شعرانے اپنی شاعری کا محور اسی رنگ سخن کو بنالیا۔

نیز کہا جاتا ہے کہ 'ہرعروجے رازوالیست' کہ جب دہلی اجڑ گئی اور ادھر لکھنؤ کے حالات بھی خراب ہونے لگے تو کچھ لکھنوی شعرانے باقاعدہ طور پر رخت سفر باندھا اور چونکہ رامپور اس وقت دیگر ریاستوں کے مقابلے معاشی، علمی اور تہذیبی لحاظ سے ترقی یافتہ ریاست کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے یہاں آکر جمع ہونے لگے۔

اب چونکہ رامپور میں دبستانِ دہلی ولکھنؤ دونوں جگہ کے شعرا قیام پذیر ہورہے تھے لہٰذا یہاں دونوں طرح کے

اساتذہ سخن اوران کے شاگردوں کا تال میل ہوا جس کے نتیجے میں ایک تیسرا دبستان شاعری وجود میں آیا جو ہندوستان بھر میں مقبول اور متعارف ومشہور ہوا۔

یہ کہنا ذرا دشوار گزار مرحلہ ہے کہ اس تیسرے دبستانِ شاعری کا رنگ مکمل طور پر دہلوی تھا یا لکھنوی۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس دبستان کی شروعاتی جھلکیاں قائم اوران کے شاگردوں کے ذریعے دہلوی رنگ میں رہیں مگر اسی میں جرات ومصحفی اوران کے شاگردوں کا رنگ اوراسی طرح بعد میں مومن اوران کے شاگرد ناظم وتسکین وغیرہ کا رنگ بھی شامل رہا۔ لہٰذا حقیقت سے قریب تر یہی امر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے دوطرزوں کے امتزاج سے رامپور میں ایک تیسرے طرز کی بنیاد پڑی۔ بہر حال یہ دبستانِ سخن اکثر دہلوی اور کبھی کبھی لکھنوی ادا کا اظہار کرتا ہے اور کہیں کہیں اپنے تیسرے منفرد رنگ میں بھی نظر آتا ہے۔

رامپور کوایک تیسرے گنگا جمنی دبستان سے موسوم کیا جاتا ہے دبستانِ رامپور کے تیسرے طرزعمل کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شعرائے روہیل کھنڈ نے دہلی کی طرح اجڑنا بھی دیکھا تھا اور وہ شعرائے لکھنو کی طرح کم وبیش عہدعیش و عشرت سے بھی گزرے تھے۔

ذیل میں ہم روہیل کھنڈ کی چند نمایاں خصوصیات روہیل کھنڈ کے چند نمائندہ شاعروں کے اشعار کی مثالوں کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔

1۔حزن ویاس کا اظہار:

دل جب درد والم اور رنج وغم سے پر ہو جاتا ہے یا پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے تسلسل دراز ہو جاتا ہے تو ایسے میں یا تو بے ساختہ دردوغم کا اظہار یا مایوسی اور ناامیدی کا بیان زبان حال سے ہونے لگتا ہے۔ شعرائے روہیل کھنڈ چونکہ دہلی کی بے اطمینانی اور بے سکونی، خراب حالی اور نفسانفسی سے دوچار ہوتے چلے آئے تھے۔ انہوں نے آبادیوں کو اجڑتے اور دردوکرب کے مارے ہوئے لوگوں کو سسکتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی نظروں میں کسی شے کو ثبات نہ تھا اور ساتھ ہی 1774 کی جنگ روہیلہ کا پس منظر بھی ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ لہٰذا ان کی شاعری پر دہلی اور روہیل کھنڈ کی تباہی وبربادی کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ناپائیداری، فنائیت، حزن ویاس کا اظہار شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں کچھ مثالیں شعرائے روہیل کھنڈ کے اشعار سے پیش کی جاتی ہیں:

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

میں وہ اسیر قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے
نہ سیر باغ کی نے روئے گلستاں دیکھا
ہو کر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندہ کے خریدار بہت
قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار سے بیمار بہت
دل کو کیا باندھے ہے گلزار جہاں سے بلبل
حسن اس باغ کا اک روز خزاں ہووے گا
دل گنوانا تھا اس طرح قائم
کیا کیا تو نے ہائے خانہ خراب
نہ جرم اس کا ہے ثابت نہ کچھ مری تقصیر
خدا ہی جانے کہ رنجش کا کیا ہوا باعث

(قائم چاندپوری)

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو
غم ہوگا تمہیں بھی گر کہوں گا
کسی چرچہ میں دل نہیں لگتا
یاالٰہی یہ کیا ہوا دل کو
ان کو میں کا طرح بلاؤں نظام
یاد کیا بات پر بھی آتے
کیا کہیں یہ کہ کب ان تک ہے رسائی اپنی
پوچھنے والوں سے کہتے ہیں کہ ہاں مل آئے

وہ مجھ کو نظام کیوں مناتے
کیا جانیے یہ بھی کیا محل تھا
(نظاؔم)

کیا یاس کو روئیں کہ نہ تھی چشم تر ایسی
ہچکی نہ لگی رہتی تھی دو دو پہر ایسی
ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آکر
کچھ جذبہ محبت کو لگی ہے نظر ایسی
رنج دنیا میں بہت پاتے ہیں ہم
اس محلّہ سے اٹھے جاتے ہیں ہم
سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا
(بیماؔر)

شب فراق میں دل پر قلق ابھی سے ہے
سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے
یہ کون اٹھ گیا جس کے جانے سے عشرت
اداسی برستی ہے دیوار و در پر
ہے ہائے جو یہ ہستی موہوم پہ ہر گل
روتی ہے یہ شبنم کہ بھروسہ نہیں دم کا
(عشرؔت)

دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و دواں
گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا
دین تو کھویا ہی دنیا بھی نہ کی کچھ حاصل
شوق ناکارہ اِدھر کا نہ ادھر کا نکلا
کیا دل کافر مرا مردود دیر و کعبہ ہے
نے بتوں سے ربط اس کو نے خدا سے آشنا
اب کیا رہا ہے جس پر رقیبوں کا ڈر کریں
ہم تو بروں کو جان کو پہلے ہی رو چکے
رلا کے اپنے لیے دل مرا نہ کھونا تھا
سمجھ تو اپنا ہی گھر کیا تجھے ڈبونا تھا
آہ اک دم نہ رہی صحبت یاراں باقی
رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

(شوقؔ)

ہوں میں وہ مرغ چمن بعد اسیری جس کو
بال و پر توڑ کے کرتا نہیں صیاد پسند
یہ بار غم فراق رفعت
اتنا تھا کہ جس کو سہ گئے ہم
کچھ نہیں ہم میں بغیر از دل سوزاں رفعت
پیرہن صورت فانوس نظر آتا ہے
کب نظر میں ان کی آوے جلوہ گل عندلیب
جو مدام آنکھوں سے یاں لخت جگر دیکھا کیے
گلستاں ترک کر کے باغباں ہم بن میں جا بیٹھے

تمہارا جس پہ جی چاہے کرو جور و جفا بیٹھے

(رفعتؔ)

2۔تصوف:

شاعری میں قناعت،صبر وتوکل،نفی ذات،اخلاقی قدر،کردارسازی،دنیابیزاری اوراشیاء عالم کی بے ثباتی کے مضامین استعمال کرنا رنگ تصوف کہلاتا ہے۔اسے بلفظ دیگر عشق حقیقی کے مظاہرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔تصوف یا صوفیانہ رنگ وتاثرات کا اظہار بھی شعرائے روہیل کھنڈ کامحبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔اس زمانہ کے حالات کچھ ایسے ہی تھے ہرطرف افراتفری اور بے سکونی کا ماحول قائم تھا۔لوگ ترک دنیا اوراندرون دل کی طرف مائل رہتے تھے۔جب انسان پریشاں حال ہوتا ہے تو اس کے دل کا رجحان حقیقت وروحانیت کی طرف بڑھنے لگتا ہے نیز جس طرح یہ رنگ سخن شعرائے دہلی کوفارسی شعراء کے توسط سے نصیب ہوا۔اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ شعرائے روہیل کھنڈ کو یہ طرز اورادا شعرائے دہلی سے میسر ہوئی۔

شاعری میں صوفیانہ فکر وخیال کے آنے سے کئی طرح کی خوبیاں پیدا ہوئیں۔تصوف نے سخن میں گہرائی و گیرائی،تہ داری،اعلیٰ ظرفی،وسعت فکراورطرح طرح کے مفاہیم ومضامین کا اضافہ کیا۔اوردل چسپ ترکیبیں،شگفتہ الفاظ اورحسن صنعت کا انتخاب بخشا۔

بطور مثال چند مثالیں ملاحظہ کریں:

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا
اے غافل فرصت یہ چمن مفت نظر ہے
پھر فصل بہار آئے نہ موسم ہو خزاں کا
مقدور نہیں قدرت خالق کے بیاں کا
گو تن پہ ہر اک بال کو ہو حکم اذاں کا
تا بہ فلک نالہ تو پہنچا تھا رات
میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر رہ گیا

(قائم چاندپوری)

آپ ہی آپ ایسے روئے نظام
دل میں کچھ دھیان آ گیا ہوگا
کسی چرچہ میں دل بھی لگتا
یاالٰہی یہ کیا ہوا دل کو
اب حال نظام کچھ نہ پوچھو
غم ہوگا تمہیں بھی گر کہونگا

(نظام)

مدت ہوئی کہ نالہ سوزاں نہیں سنا
کوچہ سے ترے حضرت رفعت کدھر گئے
باندھ کے عالم سے آہ رخت کو جب ہم گئے
اور تو یاں کچھ نہ تھا لے کے مگر غم گئے
کا کی تو جستجو میں آہ پھرتا ہے بیدم ابر ساں
نعرہ زنان و گریہ ناک خاک بسر برہنہ پا

(رفعت)

جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں
خدا ہی کا جلوہ عیاں دیکھتا ہوں
نہ تن دیکھتا ہوں نہ جاں دیکھتا ہوں
تجھی کو نہاں اور عیاں دیکھتا ہوں
جب بر در دل حضرت عشق آن پکارے

گوشے ہوئی عقل اور ہوئے اوسان کنارے

جوش زن ہے عشق کی مے اب خم دل میں نیاز

گہ ابل کر وہ گرے گہ خم سے نکلے پھوٹ پھوٹ

کیا جوش میں ہے اب مے وحدت خم دل میں

ابلے ہے پڑی رومی و عطار سے کہ دو

(شاہ نیآز)

3۔عشق مجازی:

عشق اپنی کیفیات کے لحاظ سے اور محبوب کے پیش نظر عام طور پر دو صفتوں سے متصف کیا جاتا ہے، حقیقی اور مجازی۔ عشق حقیقی کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے، عمومی طور پر یہی تصور کیا جاتا ہے۔لیکن دنیوی کسی محبوب سے تعلقات قلبی کے لگاؤ کو عشق مجازی کہا جاتا ہے۔تصوف کی طرح عشق مجازی نے بھی اردو شاعری کو طرح طرح کے اظہار خیالات بخشے ہیں۔

عشق مجازی کا اظہار دبستان دہلی اور لکھنؤ دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن دونوں کی کیفیت قدرے مختلف ہے لکھنوی اظہار خیال پر ہواس وعریانیت عیاں رہتی ہے جب کہ دہلوی شعرا کے یہاں عشق مجازی کا اظہار پاک اور صاف پیرائے میں نظر آتا ہے۔ان کے یہاں عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی، بیان واظہار دل کی گہرائیوں سے کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر طرح کے جذبوں کا اظہار سچائی اور دیانت داری کے ساتھ نظر آتا ہے۔

شعرائے روہیل کھنڈ نے عشق مجازی کے اظہار میں دبستان لکھنؤ کی روش نہ اپنا کر شعرائے دہلی کی پیروی کو ترجیح دی ہے۔اس سلسلے میں وہ انہیں کے مقلد نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں ہو بہو شعرائے دہلی کی طرز پر اظہار میں خلوص و گہرائی اور وہی وارفتگی نظر آتی ہے۔

مثالیں ملاحظہ کریں:

کان تک یار کے قائم مرے اس عالم سے

رفتہ روزے جو گزر جانے کا مذکور گیا

سن کے اتنا تو کہا حیف کہ اب دنیا سے

ناز برداری کا معشوق کی دستور گیا
غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا
خوب نکلے ہم اس کے کوچے سے
ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل
دل گرا شاید اضطراب میں رات
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا
ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا
(قائمؔ)

روکے ہنس پڑتا ہوں ظالم ہنس کے رو دیتا ہوں میں
مہربانی پہ تری دشمن کو خنداں دیکھ کر
کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے
وہ سن کر حال مرا کچھ نہ بولے
مگر ہر بات پر گردن ہلا کی
بیمار لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحاں
کمبخت پھر وفا کا تجھے حوصلہ ہوا
(بیمارؔ)

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا
ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

میں ادھر بھول گیا رنج فراق
وہ ادھر عذر جفا بھول گیا
یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے
پوچھتے حال ہیں اکثر میرا
(نظاؔم)

معشوق کس کے بس کے ہیں ناظم خدا سے ڈر
میرا ہی دل ہو کاش مرے اختیار میں
وہ اٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر
اور میں سمجھا کہ اٹھے ہیں مری تعظیم کو
فرہاد ہوس پیشہ نے بھی دی تو سہی جان
پر شیوہ ارباب وفا اور ہی کچھ ہے
میرا ان کا معاملہ ناظم
کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے
(ناظؔم)

کیا کریں کرنے کو کر بیٹھے ہم اس بت سے بگاڑ
ایسا روٹھا کہ وہ پھر ہم سے منایا نہ گیا
پند ناصح نہ کر کہ اب پتھر
دل ہوا دیکھ ان بتاں کی ادا
گو اب ہزار شیخ نے ہم سے بنائی بات
پر روبرو بتاں کے نہ ہرگز بن آئی بات
عالم نے دیکھ سوز دل اور چشم تر مری

سو سو طرح کی اس سے لگائی بجھائی بات
جس سنگ دل پہ اپنی جاں ان دنوں نظر ہے
تصویر اس کی دل پر یاں نقش کالحجر ہے
کب منفعت کسی کو خوش قامتوں سے پہنچے
گلشن میں سرو کیسا دیکھو تو بے ثمر ہے
خیال زلف و رخ میں نت مری اوقات کٹتی ہے
اسی میں دن گزرتا ہے اسی میں رات کٹتی ہے

(شوقؔ)

ابھی لکھا بھی نہیں حال دل اسے قاصد
ہوائے شوق میں اڑتا ورق ابھی سے ہے
کسی نے شام کے آنے کو کیا کہا عشرت
کہ منہ پر آپ کے پھولی شفق ابھی سے ہے
غیروں سے ہنسا وہ جو مرے سامنے عشرت
کچھ بس نہ چلا دیکھ کے آنسو نکل آئے
زلف سے کیوں نہ ہوتا دل کو ربط
وہ پریشاں تھی یہ بھی ابتر تھا

(عشرتؔ)

4۔صداقت وواقعیت:

مضامین سخن میں مبالغہ آرائی، تصنع یا بے جا پن یعنی حد سے تجاوز کر جانا غیر معتدل رویہ تصور کیا جاتا ہے لٰہذا شعری مضامین میں ان سب باتوں سے پرہیز کرنا صداقت وواقعیت کہلاتا ہے۔اگر چہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برا نہیں ہے لیکن جب کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اسے مناسب اور موزوں نہیں سمجھا جاتا اسی طرح حد

سے زیادہ مبالغہ شعروسخن کو مضحکہ خیز بنادیتا ہے۔

شعرائے دہلی کی طرح شعرائے روہیل کھنڈ کے یہاں بھی اعتدال پسندی، میانہ روی اور فکر گیری میں تناسب پایا جاتا ہے ان کا بیان عموماً تصنع سے دور رہتا ہے۔

شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو میاں
سنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں
وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا بار نکہت گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھ کو
مری نظر میں قائم یہ کائنات تمام
نظر میں گو کوئی لاتا نہیں ہے یاں مجھ کو
خس نمط ساتھ موج کے لگ لے
بہتے بہتے کہیں تو جائے گا
گزری اک عمر گرچہ قفس میں ہمیں پہ ہے
جی میں وہی ہوائے گل و گلستاں ہنوز
بہار عمر ہے قائم کوئی دن
اسے چوں گل پیارے کاٹ ہنس کر
آج قائم کے شعر ہم نے سنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

(قائم)

گرچہ پامال کیا تھا مجھے صیاد نے لیک
کردیا عشق نے اس قد کے مرا نام بلند
سنگ گراں کسی نے اٹھایا تو کیا ہوا

زور آور اس کا نام ہے جس نے اٹھائی بات
غیر از جواب منہ سے سخن مت نکالیو
رفعت یہ کوہسار نے ہم کو سنائی بات
کچھ نہ ہم سے سادہ لوگوں سے ہوا جوں آئنہ
غیر کے بیدم مگر عیب و ہنر دیکھا کیے

(رفعت)

5۔سادگی:

پیچیدہ تراکیب، بے جا صنعتیں اور تشبیہات واستعارات سے بچتے ہوئے صاف وشستہ عام فہم اور سادہ زبان کے استعمال کرنے کو سادگی سے تعبیر کیا جاتا ہے شعرائے روہیل کھنڈ کے یہاں لفظی صناعی سے زیادہ فطری حسن پر توجہ دی جاتی ہے۔

نمونہ اشعار:

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کیا
پیامبر کے ہمیں آپ ساتھ جانا تھا
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
روبرو میرے غیر سے تو ملے
یہ ستم تو سہا نہیں جاتا

(قائمؔ)

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا ڈر کریں
ہم تو بروں کی جان کو پہلے ہی رو چکے
گر اسی طور نت ستایئے گا
کس توقع پہ دل لگایئے گا

(شوقؔ)

جفا کرکے وفا کیا چاہتا ہے بے نیازوں سے
جو تو نے ہم سے ایسی کی تو ہم نے یار ایسی کی
ٹالتا ہے وصل کے وعدوں پہ وہ برسوں مجھے
روز بتلاتا ہے ظالم آج کل پرسوں مجھے
جفا کر کے وفا کیا چاہتا ہے بے نیازوں سے
جو تو نے ہم سے ایسی کی تو ہم نے یار ایسی کی

(رفعتؔ)

6۔جذباتِ عشق:

دل پر طاری ہونے والی کیفیات، احساسات اور جذبات کثیر ہوتے ہیں۔انھیں کسی بھی زبان میں کماحقہ بیان کر پانا بے حد دشوار گزار مرحلہ ہے۔قادرالکلام اہلِ سخن ایک عرصہ دراز سے طرح طرح کی کوششیں کرتے چلے آرہے ہیں لیکن آج تک دل کے درد کو ہو بہو احساس کا جامہ پہنا دینا مشکل ترین کام تصور کیا جاتا ہے۔بہر کیف شعرا اپنی اپنی لیاقت و صلاحیت اور استعداد بھر جد و جہد ضرور کرتے رہے ہیں اور تا قیام قیامت کرتے ہی رہیں گے۔جذباتِ عشق کو انھی مختلف پیرایوں میں پیش کرنا جذباتِ عشق کا اظہار کہلاتا ہے جو تقریباً اکثر شعرا کا جداگانہ رہتا ہے۔لیکن چونکہ زبانیں لفظوں کی محتاج ہوتی ہیں اس لیے اکثر شعرا کے یہاں عشق کے اظہار میں یکسانیت نظر آتی ہے۔

ذیل میں کچھ اشعار دیے جاتے ہیں جن سے شعرائے روہیل کھنڈ کے اظہارِ عشق کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کیا
پیامبر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا
ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا اپ ہی تجھ سے میں اور اپ ہی من گیا
اے وہ کہ تو کرے ہے ہر آزار کا علاج
جز مرگ کچھ بھی ہے ترے بیمار کا علاج
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل میں شاد کیا
ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا
آتش عشق میں جلنا نہیں کار آساں
ہر مگس سے نہ طلب کر جگر پروانہ
ہمنشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے
ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے
بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے

(قائمؔ)

سو جتن لاکھ فسوں سحر ہزاروں ہی کیے
اس پری رو کا پہ سر سے مرے سایہ نہ گیا
مثل گل لاکھ رکھیے پردوں میں
بوئے الفت چھپی نہیں رہتی
کچھ عشق ہی ہوتا ہے الٰہی مرض الموت
جس رنج کو سنتے ہیں نہ دارو نہ دوا کا
ہے تجھ گلی میں شور فغاں جان ہم تلک

یہ دھومیں دیکھتے ہو مرے دم قدم تلک

(شوقؔ)

اس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی

اے محبت اسے کیا کہتے ہیں

ہوشیاری میں جو آرام نہ پایا ہم نے

جان بوجھ آپ کو دیوانہ بنایا ہم نے

کھال کھینچے کوئی یا دیوے چڑھا سولی پر

جیتے جی عشق سے کب ہاتھ اٹھایا ہم نے

آنکھ تو روکے چھوٹ جاتی ہے

دل بچارے پہ آفت آتی ہے

(حسرتؔ)

ان کو میں کس طرح بھلاؤں نظام

یاد کس بات پر نہیں آتے

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا

ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا

ان کو میں کس طرح بھلاؤں نظام

یاد کس بات پر نہیں آتے

(نظامؔ)

کون پرساں ہے حال بسمل کا

خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

بیمار اور اس کے سوا کچھ خبر نہیں
الجھا ہوا ہوں حادثہ ناگہاں کے ساتھ
بیمار لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحاں
کم بخت پھر وفا کا تجھے حوصلہ ہوا
جس طرح یہاں شوخ زباں تیز ہے تقریر
کیا منہ کو کھلے واں بھی زباں نامہ بر ایسی
بیاں ہو عیب طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے
خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے

(بیمارؔ)

اپنے گھر جبر سے ان کو نہ بلاؤ ناظم
بندہ عشق ہوئے تم تو حکومت کیسی
طول شب ہجر جانتا ہوں
مرنا مجھے لاکھ بار ہوگا
اپنے گھر جبر سے ان کو نہ بلاؤ ناظم
بندۂ عشق ہوئے تم تو حکومت کیسی

(ناظمؔ)

7۔ادانگاری:

شعرا کے یہاں حسن محبوب کی تعریف وستائش مختلف رنگوں میں پائی جاتی ہے محبوب کے دلفریب حسن کی تعریف اس طرح بیان کرنا کہ اس کے کسی فعل یا حرکت کی طرف اشارہ ہوادانگاری کہلاتی ہے اس میں دبستانِ لکھنؤ کا اونچا مقام ہے شعرائے روہیل کھنڈ پر چونکہ دہلوی شعرا کا اثر زیادہ ہے اس لیے ان کے یہاں یہ کم ہی دستیاب ہے:

جس ادا سے ہے اس جواں کی ادا

کون رکھتا ہے ایسی بانکی ادا
سمجھے جو کوئی محرم اسرار عیب ہو
تیرے دہان تنگ کی میں نے نہ بات کی

(رفعتؔ)

انداز اپنے دکھاتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
بنانا شب و روز وہ بگڑے بال
وہ آئینہ دو دو پہر دیکھنا
خدا جانے کیا کچھ دکھائے مجھے
یہ چھپ چھپ کے اپنا ادھر دیکھنا
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے، یاد ہے نظام
منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

(نظامؔ)

8۔درد:

شعرائے روہیل کھنڈ کے یہاں درد، چبھن، گھٹن، بے قراری اور کسک بھی بکثرت نظر آتی ہے:

آہ اے پیر چرخ قائم نام
یاں جو رہتا تھا اک جواں ہے یاد
میں وہ اسیر قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے
نہ سیر باغ کی نہ روئے گلستاں دیکھا

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

بے کسی اپنی کس کو سونپ مروں
میں تو رکھتا تھا اس کو جاں کی طرح

لوٹنا خوں میں گلستاں کی طرح
کہہ تو اے دل یہ ہے کہاں کی طرح

ایک مدت کی مشق بلبل نے
پر نہ آئی مری فغاں کی طرح

گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لیے
کوئی دم اور نفس کا شمار باقی ہے

(قائمؔ)

کیا کہیں آپ کے نزدیک ہی رہتا ہے نظام
روز پچھلے کو جو رونے کی صدا آتی ہے

آپ ہی آپ ایسے روئے نظام
دل میں کچھ دھیان آ گیا ہوگا

(نظامؔ)

آہ اک دم نہ رہی صحبت یاراں باقی
رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و تواں
گھر کا گھر لٹ گیا پر ہم سے بھلایا نہ گیا

جز راہ عدم اور نہ پڑتا ہے نظر کچھ

کرتا ہوں تصور میں اگر اس کے دہاں کے
اس ضعف کو پہنچا ہے ترے ہجر میں قدرت
نے نالہ و آہ و نہ فریاد و فغاں کا

(شوقؔ)

شاعر اپنے اوپر کئی طرح کی کیفیتیں طاری کرنے کے بعد شعر کہتا ہے۔ عافیت کے ایام میں فکر و خیال کی کیفیت جدا رہتی ہے اور کسی بھی طرح کے تکلیف دہ حادسات و واقعات سے دوچار ہونے کے بعد کیفیت دل مختلف ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہر دبستان شاعری کا رنگ سخن حالات و کوائف کے مختلف ہونے کے سبب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ یونہی ایک ہی عہد یا ایک ہی مقام کے شعرا کی فکریں بھی ان کے ذاتی معاملات کے مختلف ہونے کے سبب مختلف ہوتی ہیں۔ جس کا اثر شعرا کے کلاموں پر عیاں ہوتا ہے۔ بہرحال شاعر جب اپنی اندرونی دنیا یعنی اپنے ہی من میں ڈوب کر باہری دنیا سے لاتعلق و بے غرض ہو کر جو شعر کہتا ہے اسے داخلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ داخلیت اپنے اظہار میں قسم قسم کے رنگوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن اکثر اس میں عشق و محبت، مصائب و آلام اور دیگر واردات قلبی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جبکہ خارجیت اس سے الگ ہے خارجیت کے مضامین، اس کا مزاج اور رنگ سخن ظاہری حسن کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس میں لفظی صنعت گری اسلوب کی چاشنی اور بے جا تکلفات سخن کو بروئے کار لانے کی سعی پیہم کی جاتی ہے۔

بہرحال شعرائے روہیل کھنڈ کی داخلیت ان کی خارجیت پر نمایاں نظر آتی ہے ان کے یہاں مختلف طرح کی خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ رمزیت اور اشاریت بھی موجود ہے۔ تصوف چونکہ ایک فکری شغل ہے اس کے سبب اردو شاعری کو عروج نصیب ہوا فکر و خیال میں وسعتیں پیدا ہوئیں بلندی اور گہرائی و گیرائی نصیب ہوئی اسلوب میں متانت و سنجیدگی در آئی لہٰذا وہیں رمزیت و اشاریت کو بھی فروغ ہوا صوفیانہ طرز شعر نے شعرائے روہیل کھنڈ کو قابل قدر رمز و کنایہ عطا کیا ہے۔ مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی فکری و فنی جہتیں شعرائے روہیل کھنڈ کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ لیکن بیان درد اور اظہار عشق کو روہیل کھنڈ کی جملہ خصوصیات میں سے ممتاز خصوصیات شمار کیا جا سکتا ہے۔

*****

اختتامیہ

گزشتہ مباحث پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علاقۂ روہیل کھنڈ میں بھی شعرا اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ابھی تک یہاں کے 1857ء تک کے شعرا کی شاعری کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جس کا مجموعی جائزہ بطور لب لباب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

علاقۂ روہیل کھنڈ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہمیشہ حکمرانوں کی نظروں میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جس کے سبب یہاں کی تاریخ میں ہمیں کافی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس علاقہ میں موجودہ دور میں نو اضلاع یعنی بجنور، امروہا، مرادآباد، سنبھل، رامپور، بریلی، بدایوں، پیلی بھیت اور شاہجہاں پور شامل ہیں۔ جس طرح یہاں کے حکمرانوں نے اس علاقہ کو ترقی بخشی اسی طرح اس علاقہ کے شعرا نے بھی اردو شاعری کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا آغاز کب ہوا یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن جو جھلکیاں گیتوں، کہہ مکرنیوں اور دوہوں وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں شاعری آغاز بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی میں ہوا ہوگا۔ لیکن پندرھویں صدی عیسوی تک کسی بھی ایسے شاعر کا نام نظر نہیں آتا جو علاقۂ روہیل کھنڈ سے تعلق رکھتا ہو۔ البتہ امیر خسرو یا دیگر حضرات کا اس دور میں شاعری کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں بھی اسی دور سے شاعری کا آغاز ہوا ہوگا۔

تذکروں اور دوسری تواریخ کی کتب کا مطالعہ کرنے پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روہیل کھنڈ میں اردو کے پہلے شاعر ملا نوری ہیں جن کا تعلق سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے تھا۔ ان کے بعد سترھویں صدی کے نصف آخر میں اسمٰعیل و اعظم اور اٹھارھویں کے نصف اول میں ثاقب اور سعادت وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔

1765ء تک آتے آتے علاقۂ روہیل کھنڈ میں شعرا اچھی خاصی تعداد میں نظر آنے لگتے ہیں جو اپنی اپنی روش سخن میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ مثلاً: لالہ خوش وقت رائے شاداؔب، محمد شاکرؔ، ہدایت علی خاں ضمیرؔ، مراد علی حیرتؔ،

اکرام اللہ محشرؔ،نواب عنایت خان، معین الدین اور خواجہ حسن وغیرہ۔لیکن یہ سب یکجا مشق سخن میں مشغول نہ تھے بلکہ ان میں سے کچھ شعرا ایسے تھے جو ریاست روہیل کھنڈ کے مرکزی مقام آنولہ میں دادسخن دے رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو اپنے اپنے مقام یعنی علاقئہ روہیل کھنڈ کی حدود کے دوسرے علاقوں میں سخن پر فکر آزمائی کر رہے تھے۔

اس کے بعد جب بانی ریاست روہیل کھنڈ نواب علی محمد خان کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند نواب محمد یار خان امیرؔ کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوتا ہے تو وہ کبیر سنبھلی کے مشورہ پر قائم چاند پوری کو اپنے دربار ٹانڈہ بلا لیتے ہیں۔جس کے بعد ٹانڈہ میں شعرا کا اجتماع ہونے لگتا ہے اور علاقئہ روہیل کھنڈ میں یہ پہلا مرحلہ تھا کہ کسی محفل سخن کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ان محفلوں میں شرکت کرنے والے نمایاں شعرا میں قائمؔ چاند پوری،کبیر سنبھلی، مصحفیؔ،فدویؔ لاہوری، پروانہؔ مرادآبادی،عشرت ہزال،عزیز خاں ہیجانؔ اور محمد نعیم وغیرہ ہیں۔

لیکن 1772ء میں نواب ضابطہ خان والی نجیب آباد کے ساتھ نواب محمد یار خان کے شریک جنگ ہونے اور شکست کے نتیجہ میں یہ محفلیں منعقد ہونا بند ہوگئیں۔اس کے بعد شجاع الدولہ کے روہیل کھنڈ پر قابض ہونے کے سبب نواب موصوف چند بچے ہوئے شعرا کو رامپور لے آئے اور یہاں پھر سے محفل شعر و سخن قائم ہونے لگی۔

اس محفل سخن کے قائم ہونے سے پہلے علاقئہ روہیل کھنڈ کے اکثر شعرا دہلی کا رخ کیا کرتے تھے جس کی نمایاں مثال قائمؔ اور مصحفیؔ ہیں۔لیکن جب یہ محفل شعر و سخن یہاں سجی اور اساتذہ سخن جمع ہوئے تو علاقہ روہیل کھنڈ کے شعرا نے کچھ حد تک دہلی کا رخ نہ کرکے ٹانڈہ کا رخ کیا اور جب یہاں کی محفلیں ختم ہوئیں تو رامپور کا رخ کیا۔

سن 1800ء تک آتے آتے روہیل کھنڈ کی شاعری اپنے ارتقاء کے ابتدائی دور میں پہنچ چکی تھی جس میں ہمیں قائمؔ چاند پوری،مولوی غلام جیلانی رفعتؔ، قدرت اللہ شوقؔ، شاہ نیازؔ احمد بریلوی، میر غلام علی عشرتؔ،عنبر شاہ خان شیفتہؔ اور عزیز خاں ہیجانؔ وغیرہ جیسے قادرالکلام شعرا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس کے بعد 1857ء تک پہنچتے پہنچتے یہاں کی شاعری اپنے ارتقا کی مسافت کو طے کر لیتی ہے جس میں ہمیں اخون زادہ احمد خان غفلتؔ،شاہ رؤف رافتؔ، احمد علی خاں رندؔ، شیخ علی بخش بیمارؔ، یوسف ناظمؔ اور نظامؔ رامپوری وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یوں تو روہیل کھنڈ کے شعرا نے اردو ادب کی تقریباً تمام ترنظمیہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً رباعی،قطعہ، ہجو،قصیدہ،شہر آشوب، چہار بیت اور مثنوی وغیرہ۔لیکن دیگر علاقوں کے شعرا کی طرح یہاں کے شعرا کی اکثریت کا بھی دلچسپ مشغلہ غزل گوئی رہا ہے۔اسی میں ان کے طرح طرح کے علمی، عشقی اور فکری جوہر اپنے عروج پر پہنچے ہوئے نظر

آتے ہیں۔

جب ہم روہیل کھنڈ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں کی شاعرانہ فضا پر فکر و مضامین کے لحاظ سے مختلف طرح کے رنگ سخن چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے ابتدائی دور میں دہلوی رنگ نمایاں طور پر ظاہر تھا جس کی کئی وجوہات رہی ہیں مثلاً روہیل کھنڈ کے سیاسی و معاشی تعلقات کا دوسرے علاقوں کے مقابل زیادہ تر دہلی سے قائم رہنا نیز ٹانڈہ میں قائم چاند پوری کی آمد کے بعد اس علاقہ کے شعرا کا قائم کے ہی طرز سخن کو اپنا لینا وغیرہ۔ بہر کیف یہ متحقق ہے کہ یہاں کی ابتدائی شاعری میں دہلوی رنگ کا پرتو مکمل طور پر پایا جانے لگا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد روہیل کھنڈ کا سیاسی تعلق لکھنو سے قائم ہوا تو یہاں کی شاعری پر لکھنوی رنگ سخن کا اثر بھی پڑا جسے اس دور کی شاعری پر ہئیت یا مضامین دونوں صورتوں کے لحاظ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں کے شاعرانہ ذخیرے میں بحیثیت اصناف نظم غزل مقدم ہے اور فکر و تخیل یا مضامین کے لحاظ سے یہاں حزن و یاس، تصوف، عشق مجازی، صداقت و واقعیت، سادگی، جذبات عشق کا اظہار، ادا نگاری اور معاملہ بندی صاف طور پر نمایاں نظر آتے ہیں یہی روہیل کھنڈ کی شاعرانہ خصوصیات ہیں۔ لیکن ان سب کے باوصف اگر مواد مضامین کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ حصہ جذبات عشق کے اظہار پر ملتا ہے۔

روہیل کھنڈ میں اس عہد کے ممتاز و اساتذہ روزگار شعرا آ کر جمع ہوئے تھے جنھیں دنیائے ادب میں شعر و سخن کے معمار اور محسن کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ قائم، نظام، شوق، بیمار اور غفلت وغیرہ جیسے مشاق اور قابل قدر و منزلت شعرا کی آماجگاہ رہا ہے۔ عہد رفتہ سے لیکر عہد حاضر تک علاقہ روہیل کھنڈ میں سخن و فن کا بول بالا رہا ہے آج بھی یہاں کی شاعری میں عہد رفتہ کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

*****

کتابیات

بنیادی کتب

نمبر شمارہ	کتاب کا نام	مصنف	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	گل رحمت (تاریخ روہیل کھنڈ)	سعادت یار خاں	ڈائمنڈ پرنٹرز، دہلی	2002ء
2	اخبار الصنادید	مولانا نجم الغنی	مطبع نول کشور، لکھنو	1918ء
3	مخزن نکات	قائم چاند پوری	مطبع عالیہ، لاہور	1966ء
4	طبقات الشعرا	قدرت اللہ شوق	مطبع عالیہ، لاہور	1968ء
5	تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	1985ء
6	ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	1985ء
7	کلیات قائم	قائم چاند پوری	زرین آرٹ پریس	1965ء
8	تاریخ جام جہاں نما	قدرت اللہ شوق		
9	مثنوی اسرار محبت	محبت خان محبت	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	1996ء
10	دیوان محبت	محبت خان محبت		
11	دیوان نیاز	شاہ نیاز احمد بریلوی	مطبع نول کشور، لکھنو	1903ء
12	مثنوی پدماوت	میر غلام علی عشرت	مجلس ترقی ادب، لاہور	1967ء
13	مثنوی ریاض الحسین	میر غلام علی عشرت	رضا لائبریری، رامپور	
14	دیوان غفلت	اخون زادہ احمد خان غفلت	رضا لائبریری، رامپور	

15	دیوان بیمار	شیخ علی بخش بیمار	خواجہ پریس، دہلی	2003ء
16	کلیات نظام	سیدنظام شاہ نظام	مطبع عالیہ، لاہور	1965ء

ثانوی کتب

1	حیات حافظ رحمت خان	سید الطاف علی بریلوی	ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس	1963ء
2	تاریخ روہیلہ	نفیس صدیقی	ڈائمنڈ پرنٹرز، دہلی	2004ء
3	تاریخ روہیل کھنڈ مراد آباد	حاجی خدادادخاں	مرتضی پریس، رامپور	1941
4	تاریخ کٹھیر روہیل کھنڈ	حاجی خدادادخاں	مرتضی پریس، رامپور	1949ء
5	تاریخ روہیل کھنڈ	ڈاکٹر مصطفی حسین نظامی		1986ء
6	تاریخ روہیل کھنڈ	خالدحسن خاں رامپوری	خدابخش لائبریری، پٹنہ	1995ء
7	تاریخ روہیل کھنڈ	نیازاحمد خان ہوش		
8	تاریخ امروہا	محمود احمد الہاشمی العباسی	تجلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	1930ء
9	تاریخ سنبھل	حکیم ظل الرحمٰن		
10	نکات الشعرا	میر تقی میر	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد	1935ء
11	گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی	سرفراز پریس، لکھنو	1963ء
12	ریختہ گویاں	فتح علی گردیزی	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد	1933ء
13	چمنستان شعرا	لچھمی نرائن شفیق	دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ	1928ء
14	گلزار ابراہیم	ابراہیم خاں خلیل		
15	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1985ء
16	گلشن ہند	مرزا علی لطف	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1986ء
17	طبقات سخن	غلام محی الدین مبتلا میرٹھی	نظامی آفسیٹ پریس، لکھنو	1991ء
18	گلشن بے خار	مصطفیٰ خان شیفتہ	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1982ء
19	طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1983ء

20	خم خانہ جاوید	لالہ سری رام		
21	انتخاب یادگار	امیر مینائی	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1982ء
22	تذکرہ کاملان رامپور	حافظ احمد علی خاں شوق	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	1986ء
23	مثنوی نل دمن	فیضی	دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ	1987ء
24	اردو کی دو قدیم مثنویاں	اسمٰعیل امروہوی	مجلس ترقی ادب، لاہور	1970ء
25	لکھنو کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی	نظامی آفسیٹ پریس، لکھنو	1973ء
26	دلی کا دبستان شاعری	نورالحسن ہاشمی	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو	1997ء
27	رامپور کا دبستان شاعری	شبیر علی خان شکیب	اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی	1999ء
28	روہیل کھنڈ میں لوک گیت	راشد عزیز	گلشن آفسیٹ، لال کنواں، دہلی	2011ء
29	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ		
30	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی		
31	تاریخ ادب اردو	گیان چند جین		

*****

Serial No.: 11

Organised By

KANZA FAROGH-E-URDU SOCIETY

Railway Station Road, Hatim Sarai, Sambhal (U.P.)

National Seminar

Azadi Ke Baad Ruhailkhand Mein Ghair Afsanavi Nasr

بعنوان: آزادی کے بعد روہیل کھنڈ میں غیر افسانوی نثر

Sponsored By

National Council For Promotion of Urdu Language

(Ministry of Human Resource Development, Govt. of India, New Delhi)

27-02-2021

Certificate

It is certified that Sri./Smt./Miss/Prof./Dr. : MOHD FAIZAN

College/University/Institution : UNIVERSITY OF HYDERABAD

Participated/presited a research paper entitled : AZADI KE BAAD RUHELKHAND MEIN KHAKANIGARI in national seminar organized by Kanza Frogh-e-Urdu Society, Sambhal

Dr. Abid Husain Haidari President	Dr. Tariq Qamar Vice President	Dr. Kishwar Jahan Zaidi Secretary/Convener

Date: …………….

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"ROHILKHAND MEIN URDU SHAIYRI 1857 TAK"** submitted by **MOHD FAIZAN** bearing Registration No. **20HUHL05** in partial fulfillment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

This is also to certify that **MOHD FAIZAN** participated in the One-Day National Seminar on *"Azadi Ke Baad Ruhailkhand Mein Ghair Afsanavi Nasr"* held on 27th February 2021. He has presented the paper titled ***"Azadi Ke Baad Ruhailkhand Mein Khakanigari "*** Organized by KANZA FAROGH E URDU SOCIETY Railway Station Road, Hatim Sarai, Sambhal (U.P.)

Signature of the Supervisor
Prof. Habib Nissar

//Countersigned//

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

Date: ………….

DECLARATION

I, **MOHD FAIZAN** hereby declare that this dissertation entitled **"ROHILKHAND MEIN URDU SHAIYRI 1857 TAK"** submitted by me under the guidance and supervision of **Prof. Habib Nissar,** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga / INFLIBNET.

Name: **MOHD FAIZAN**

Signature of the Student

Reg. No. 20HUHL05

Rohilkhand Mein Urdu Shaiyri 1857 Tak

M.Phil Dissertation

Submitted by

Mohd Faizan

Supervisor

Prof. Habeeb Nisar

2022

Department of Urdu,

School of Humanities,

University of Hyderabad, Hyderabad

500046

AS PER THE UNIVERSITY POLICY, ANTI-PLAGIARISM SCREENING IS NOT REQUIRED FOR THE REGIONAL LANGUAGES

Librarian
Indira Gandhi Memorial Library
UNIVERSITY OF HYDERABAD
Central University P.O.
HYDERABAD-500 046.